مظہر سلیم

○ مظہر سلیم ایک بے رحم افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنے ایک کردار کے کرب کو دوسرے کردار کے احساس میں مدغم کرکے کردار کو ہی استعارہ کی شکل دے دیتے ہیں یعنی کردار بدل جاتا ہے لیکن وہی کرب اپنی جگہ قائم رہتا ہے جو بعد میں ہم سب کا مشترکہ کرب بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ قاری کو ہیجان انگیز کرب میں مبتلا کردیتے ہیں جیسے ان کے یہ افسانے درندہ، دیمک، اندر کا آدمی، تعاقب اور بابو جی وغیرہ۔ بہت ممکن ہے یہی خوبی ان کو انفرادی شناخت کی سیڑھی پر چڑھنے میں مددگار ثابت ہو۔

مظہر سلیم کچلے ہوئے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے احساسات و جذبات ان کے مسائل اور زندگی کی چھوٹی بڑی وارداتوں کا شعوری اور لاشعوری طور پر خوب صورتی سے تجزیہ کرتے ہیں گویا ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ مظہر سلیم اس آگ کے دریا کے ایک ایسے تیراک ہیں جو عصری مسائل اور ان کے کرب کو داخلی اور خارجی حسیّت میں تلاش کرتے ہیں اسی لیے ان کے پاس ایک عام آدمی کے غیر اہم واقعات بھی اہم بن جاتے ہیں۔

عام طور پر ان کے موضوعات گھریلو زندگی سے شروع ہو کر سماج کا ایک گمبھیر مسئلہ بن جاتے ہیں۔ گوکہ موضوع کی اہمیت فن کار کے اسلوب اور پیش کرنے کے طریقہ کار پر منحصر ہوتی ہے۔ مظہر سلیم، کہانی لکھنے کا فن خوب جانتے ہیں اسی لیے ان کا فن اور فکر مشاہدہ کی دھیمی دھیمی آنچ میں کندن بننے کے لیے مستقبل کا انتظار کر رہا ہے۔ ○○

رؤف صادق

○ نام کتاب۔ اپنے حصے کی دھوپ (افسانے)
○ افسانہ نگار۔ مظہر سلیم ○ ترتیب و اہتمام۔ ایم مبین / قاسم ندیم
○ بار اول۔ دسمبر ۱۹۹۸ء ○ سرورق۔ رؤف صادق
○ کتابت۔ ذال قاف / گرافیکا پرنٹرس بھیونڈی ○ قیمت۔ ۷۰ روپے
○ ناشر۔ ڈاکٹر شاکر حسین / تکمیل پبلی کیشنز بھیونڈی / ممبئی
○ مطبع۔ ادبی پرنٹنگ پریس ممبئی ۱۱ ○ اردو کمپوزنگ بائے ڈائمنڈ گرافکس بائیکلہ
○ افسانہ نگار کا پتہ۔ 103/B، میور اپارٹمنٹ، نیا نگر، میرا روڈ، تھانے۔
○ ملنے کے پتے
○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ممبئی / دہلی / علی گڑھ
○ اصغر حسین قریشی، کوہ نور ٹیچرس کالونی، شانتی نگر بھیونڈی
○ اکبر عابد۔ c/۱۵/۱۱ کنتی دیوی چال، ونوبا بھاوے نگر کرلا ۷۰
○ قاسم ندیم ۹/۵۰۵ لوٹس کالونی گوونڈی ممبئی ۴۳
○ محمد ظفر ولی چوک، ملکاپور ضلع بلڈانہ مہاراشٹر
○ سویرا بک ڈپو محمد علی چوک مالیگاؤں ضلع ناسک

تمام افسانوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی سے ان کا تعلق محض اتفاق ہوگا جس کے لئے مصنف یا ناشر ذمہ دار نہیں ہیں۔

تکمیل پبلی کیشنز کی پیش کش

○ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے

جزوی مالی تعاون سے

○ سعیدہ کے نام

○ جمیلہ بانو (بھابھی) کی نذر

"جن کی موت میری زندگی کا سب

سے بڑا المیہ ہے"

ترتیب

پرنٹ میڈیا میں افسانے کا ایک اور چینل

○ سلیم شہزاد

مظہر سلیم نے بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے سرکش افسانہ نگاروں میں اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے "جہاد" کے با آواز بلند فنی اظہار کے سبب نمایاں مقام حاصل کیا ہے گذشتہ بیس برسوں میں اردو افسانوں میں جو فنی اور فکری تغیرات ظہور پذیر ہوئے ہیں ان پر عصر اور ماحول کے جابرانہ تسلط میں فرد کے خلفشار زدہ ذہنی کوائف کے رنگ خاصے گہرے ہیں (اور جدیدیت کے زمانے سے فرد اس خلفشار میں مبتلا چلا آرہا ہے اگرچہ بڑی حد تک قومی اور ملکی حالات کے سبب آج اس کی نوعیت خاصی بدل چکی ہے) افراد فنکار کو جن کا نمائندہ سمجھنا چاہئے' آزادی کے بعد کے سیاسی فسادات کی دہشت' حصول زر اور دیگر مادی ضروریات کے لئے تگ ودو اور ایک وسیع ترین الاقوامی تاجرانہ خود غرضی کے آسیب کے زیر اثر جس قسم کی زندگی جی رہے ہیں (یا جینے پر مجبور ہیں) جب اپنے نمائندے کے ذریعے بالواسطہ افسانوی بیان کا موضوع بنتے ہیں تو "اپنے حصے کی دھوپ" میں (روشنی اور سایوں کے ہم آہنگ / غیر ہم آہنگ اثرات کے تحت) اس زندگی کی گومگو کی کشمکش میں مبتلا تصویریں کچھ اجاگر اور کچھ مبہم سی نظر آتی ہیں۔ یہ کیفیت مظہر سلیم کے افسانوں کو ایک ایسا ماحول یا پس منظر بھی دیتی ہے جو عصری زندگی کی حقیقی صورتحال کو کبھی بے شناخت اور کبھی جانے پہچانے کرداروں کی آؤٹ لائنز میں سامنے لاتا ہے۔ کرداروں کا یہی وصف "اپنے حصے کی دھوپ" کے افسانوی واقعات کو بھی کچھ حقیقی اور کچھ ماورائی بنادیتا ہے۔ مثلاً اس مجموعے کے افسانے "الاؤ اور ایک بوڑھا شخص" میں جھریوں دار چہرے والا بوڑھا' بے سمتی سے آنے والے بے نام حملہ آور الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے سوتے جاگتے ہیولے اور ان ہیولوں میں ایک بے شناخت وہ۔

واقعات ان افسانوں کے اچانک پھوٹ پڑنے والے مذہبی' سیاسی اور رنگ ونسل کے فسادات کی دہشت' افراط زر کے باوجود ایک بہت بڑے سماجی طبقے کے لئے حصول زر (بلکہ عام ضروریات زندگی) کی کمیابی سے پیدا ہونے والے عائلی اور سماجی مسائل اور ان حالات میں جینے والے افراد پر حالات کی تاثر آفرینی سے نفسی اور ذہنی انتشار اور تناؤ کے واضح اثرات سامنے لاتے ہیں جیسا کہ "اندر کا آدمی' دستک' کھوٹی' کوچ اور" بیئر بار" وغیرہ افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

زیر نظر مجموعے کی تخلیقات میں جدید افسانے کے سارے لکشن نہایت واضح ہیں یعنی مبہم بیانیہ مبہم کردار اور مبہم واقعات اور ان کی ترسیل کے لئے مبہم استعارے اور علامتیں وغیرہ۔ اس ذیل میں افسانوی

تم اب سو جاؤ"

"ہاں میں سوتی ہوں" (دستک)

"یہ بتاؤ کہ کیا ہم لوگ بار سے باہر آ گئے ہیں؟"

"ہاں باہر ہی تو ہیں اور گھر کی طرف جا رہے ہیں"

"نہیں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم ایک بار میں

داخل ہو رہے ہیں" (بیئر بار)

ان اظہارات کو مجموعے کے دیگر افسانوں میں کرداروں کے ذہنی اور فکری الجھاؤوں کے استعارتی بیان میں بھی دیکھا جا سکتا ہے یعنی کہیں موجود ہو کر اپنے آپ کو موجود نہ سمجھنا' کچھ نہ کرتے ہوئے کچھ کرنا یا مر کر جیے جانا جیسے تصورات۔

مظہر سلیم کے فنی برتاؤ کی ایک اور خصوصیت اپنے اظہار کو افسانے کے کسی کردار کے توسط سے مختلف نئی پرانی کہانیوں کی صورت میں بیان کرنا بھی ہے مثلاً "الاؤ اور ایک بوڑھا شخص" میں بوڑھا شخص الاؤ کے گرد بیٹھے افراد کو جاگتے رہنے کے لئے مسلسل کہانیاں سنائے جا رہا ہے:

- میں تمھیں ہمارے آباواجداد کی داستان سناتا ہوں

  (ہمارے اسلاف کی کہانیاں جو تم میں جوش بھر دیں گی)
- میں تمھیں (ایک نئی کہانی) سناتا ہوں (جو برسوں پرانی روایات پر مبنی ہے)
- یہ کوئی نئی کہانی کیوں نہیں سناتا؟ (بھلا ایسی کہانیوں سے ہمارے اندر کیا تبدیلی ہو سکتی ہے؟)
- میں تمھیں نئی کہانی سناؤں گا (اور تم سب کو جاگنے پر مجبور کر دوں گا)
- کہانی بہت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ شاید (کل) کی ہے۔ شاید (آج) کی ہے۔ شاید (ابھی) کی ہے
- فسادات پر کہانیاں اب بور لگتی ہیں۔ ایسی کہانیاں سننے سے بہتر ہے کہ آدمی سو جائے (اور پھر تم ایسی کہانیاں سنا کر کون سے نتائج برآمد کرنا چاہتے ہو)

  آباواجداد کی کہانیوں کے نام پر تم ہمیں گمراہ کر رہے ہو۔
- اب سوائے اس کے کہ وہ بوڑھا شخص انھیں سنائی ہوئی کہانیاں سنائے اور ان کہانیوں پر ایمان لائیں' کوئی چارہ نہیں۔
- اس کہانی میں کوئی دم نہیں ہے (اور ہم کب تک ایسی باسی کہانیوں کے سہارے اپنی نیند بھگانے کی کوشش کریں گے؟)

بیان کی حکایتی اور داستانی تکنیکیں بھی مظہر سلیم کے افسانوں کو جدید فکشن کے ایک اہم رجحان کا پیرو ظاہر کرتی ہیں اور یہ تمام خصوصیات افسانہ نگار کے فطری افسانوی اسلوب کی علامات ہیں۔

ایک نہایت اسلوبی وصف مظہر سلیم کے افسانوں کا یہ بھی ہے کہ ان پر دھوپ چھاؤں اندھیرا' اجالا' خواب بیداری وغیرہ کی متضاد کیفیات بیک لمحہ حاوی ہیں جن میں پھنسے ہوئے افراد خاصے کشمکش و پیچ میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ایک تجزیاتی مثال افسانے ''نیا منظر نامہ'' کی پیش ہے جس میں مظہر سلیم نے سوتے جاگتے افراد کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے ایسے افراد جو ہتھیاروں سے لیس ہونے کے باوجود کچھ کر نہیں سکتے یا کرنا نہیں چاہتے صرف بیویوں کے پہلو میں سونا چاہتے ہیں۔ یہ افسانہ شیر اور گڈریے کی معروف حکایت کو بھی افسانہ در افسانہ کی داستانی تکنیک کے طور پر استعمال کرتا ہے اس کے کردار یقیں و گماں کے بیچ معلق ہیں (بلکہ گمان ہی گمان کا شکار ہیں) اور اس سے ذرا فاصلے پر ایک پوری طرح جاگتے گڈریے کا کردار ہے جو اب شیر کو گاؤں میں داخل ہوتا دیکھنے اور ہاتھ میں بندوق رکھنے کے باوجود ''شیر آیا۔ شیر آیا'' چیخ کر گاؤں والوں کو خبردار کرتا ہے نہ بندوق کا استعمال' بس سگریٹ کا دھواں اڑاتا رہتا ہے یہاں افسانہ نگار قدامت اور جدت کو ایک دوسرے پر محمول کرنے کے لئے داستان اور حکایت کی طرف رجوع ہوا ہے۔ وہ ایک سنی سنائی کہانی دوبارہ سناتا ہے (اور سنی سنائی کہانی کو بار بار سنانے کی شکایت) مظہر سلیم کے افسانے ''الاؤ اور ایک بوڑھا شخص'' میں بھی متعدد مرتبہ سامنے لائی گئی ہے) لیکن معنوی احمال کا عمل کبھی واقع ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ ''سوتے جاگتے کا قصہ'' ایسا قول محال ہے کہ اس کی بازگوئی کے لئے فنکار کا پوری طرح بیدار رہنا ضروری ہے تاکہ افسانے میں تاثر پیدا ہو۔ ''نیا منظر نامہ'' یہ تاثر ضرور پیدا کرتا ہے کہ فنکار اپنی فنی بصیرت ، اور اس کا اظہار چاہتا ہے۔

خواب اور بیداری اور روشنی اور سایوں کے اثرات وغیرہ مظہر سلیم نے اپنے افسانوں میں اس طرح واضح کئے ہیں:

''مجھے تو نیند آ رہی ہے''

''نہیں سونا نہیں' ہم بہت سو چکے ہیں یا شاید
ہم کبھی جاگے ہی نہیں'' (الاؤ اور ایک بوڑھا شخص)

نائٹ بلب کی روشنی میں سارے مناظر میری آنکھوں کے
سامنے دوڑنے لگے۔ کمرے میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا۔

(اندر کا آدمی)

''نہیں بیٹی تمھارے کان بج رہے ہیں۔ یہ تمھارا وہم ہے۔

- ہر کہانی میں ایک جیسے کردار ہیں، ایک جیسے واقعات ہیں،
  ایک جیسے حالات ہیں، کچھ بھی تو نیا نہیں
- کہانیاں سننے اور سنانے کے لئے حالات سازگار نہیں ہیں

وغیرہ۔ ان حوالوں میں قوس کئے ہوئے اظہارات سے صنف کہانی کی افادیت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے یا اس پر کچھ سوالیہ نشانات لگتے ہیں۔

افسانے 'بیئر بار' میں ڈرامے اور اسٹیج کے استعاروں سے مظہر سلیم نے یہی فنی فائدہ حاصل کیا ہے اور اس طریق کار کو یقیناً ضرورت شعری نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے افسانہ نگار کے کہانی سنانے کے اشتیاق کی نشان دہی ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی پھول کے مضمون کو کئی رنگوں میں دیکھ اور بیان کر سکتا ہے۔

"اپنے حصے کی دھوپ" کے افسانوں کا بیانیہ تشریحی اور ڈرامائی
ہے بڑے شہر کی زندگی کی عکاسی کے رنگ متنوع نہیں 'مظہر سلیم کے ہم عصر فنکار بھی اپنے افسانوں میں ایسی ہی کم رنگ زندگی کو ایسے ہی بیانات میں پیش کر رہے ہیں۔ مظہر سلیم سے توقع ہے کہ اپنے فنی اظہار میں مزید رنگوں کا اضافہ کریں گے اور یہ اضافہ زبان کو اس کے بے شمار رنگوں میں برتنے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

OO

نئے افسانے کی بساط پر ۔۔۔ مظہر سلیم

گذشتہ چند سالوں میں جو نئے لکھنے والے سامنے آئے ہیں ان میں ایک نیا نام مظہر سلیم کا ہے۔ مظہر سلیم کی ایک کتاب 'جہاد' پہلے آچکی ہے لیکن صحیح معنوں میں 'اپنے حصے کی دھوپ' کو ان کی پہلی کتاب کہنا چاہیے کہ اس میں کئی افسانے ایسے ہیں جو مظہر سلیم کو بطور افسانہ نگار روشناس کرواتے ہیں۔ "اندر کا آدمی"، 'بابو جی، بیئر بار' جیسے افسانے ایک متجسس ذہن کا اشارہ دیتے ہیں۔ ایسا ذہن جو گردو پیش سے باخبر رہنا چاہتا ہے۔ یہ افسانے متوسط اور نچلے متوسط طبقوں کے ایسے افراد کی کہانی سناتے ہیں۔ جنہیں سماج کی بتدریج بگڑتی صورت حال کا شدید احساس ہے اور یہ تشویش انھیں سدا مضطرب اور پریشان رکھتی ہے شہری زندگی کے ان افسانوں میں استحصال سے لڑنے کی خواہش کا فطری اظہار بھی ہے اور اپنی مجبوری اور بے بسی کا احساس بھی۔ موضوع سطروں کے درمیان سے اس طرح ابھرتا ہے اور زندگی کو اس طرح مصوّر کیا گیا ہے کہ قاری خود بھی اپنے کو اس صورت حال میں شریک پاتا ہے۔ ہر خیال کو کہانی کا حصہ بنانے سے پہلے سوچنا چاہئے کہ یہ خیال افسانے کو آگے بڑھانے میں اور تاثر کو گہرانے میں کس قدر معاون ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ افسانہ نگار کردار کے ساتھ بہا چلا جارہا ہے۔ اکثر افسانوں میں ایک نوع کا انجام بھی جیسے ساتھ ہی جڑا ہوتا ہے جس سے بچنا ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ "بیئر بار" میں بیئر پیتے ہوئے لوگ ضروری نہیں کہ دکھی ہی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے انداز میں شام کا بھرپور لطف اٹھا رہے ہوں۔ اور زندگی اسی طرح بسر کرنا چاہتے ہوں۔ "بابو جی" کے کردار کو اس پہلو سے بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ دلت ہونے کے باوصف جس سماج میں وہ زندگی بسر کررہے ہیں کچھ تو برف انھوں نے کاٹی ہی ہے اور اپنے بچوں کے لئے اس دنیا سے کہیں بہتر دنیا چھوڑے جارہے ہیں۔ جس میں انھوں نے اپنی آنکھیں کھولی جس قسم کا ماحول ان کے بچوں کو ملا ہے امید کی جاسکتی ہے کہ کل اندھیرے اور کم ہوں گے۔ دل دماغ اور کھلیں گے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان

کہانیوں کو جس طرح لکھا گیا ہے اس سے کچھ مختلف ڈھنگ سے لکھنا چاہئے تھا بلکہ صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ افسانہ نگار کو کبھی کبھی کہانی یا خیال کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے اپنے اختیار کا بھی اندازہ ہونا چاہئے۔ کہانی "اندر کا آدمی" میں عمل کا اختیار ہی کہانی کا بنیادی موضوع ہے۔ اپنشد میں ایک درخت پر بیٹھے دو پرندوں کی بات کہی گئی ہے ایک پھل کھاتا ہے اور دوسرا سوچ میں گم ہے۔ فکر اور عمل کی یہ کش مکش انسان کی ہر سانس کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ آج کا انسان اس بات کو جس قدر شدت سے محسوس کرتا ہے شاید ہی کبھی محسوس کیا ہو۔ ایک طرف غلاظت بڑھتے بڑھتے اس کی چوکھٹ سے آ گئی ہے اور دوسری طرف یہ احساس کہ انسان اکیلا برائی سے نہیں لڑ سکتا۔ متوسط طبقے کی اخلاقیات اسے دامن بچا کر گزرنے کی تلقین کرتی ہے لیکن اندر کا آدمی سوچتا ہے کب تک؟ کب تک؟ وہ غلاظت سے بچ سکے گا۔ اب تو یہ ناممکن ہو چکا ہے۔ یہ کہانی اس بات کا اشاریہ ہے کہ مظہر سلیم نئے افسانے کی بساط پر قدم رکھ چکے ہیں اور آئندہ ہم ان سے خوب سے خوب تر کی توقع رکھ سکتے ہیں۔

انور خان ممبئی

اپنی بات

ترقی پسندیت اور جدیدیت کے بعد اردو ادب میں معنویت کا دور شروع ہو چکا ہے۔ جہاں تک میں نے معنویت کی اصطلاح پر غور کیا ہے تو میرے ذہن میں یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ نہ صرف اردو شاعری بلکہ اردو افسانہ بھی جدیدیت کے بعد معنویت کے دور سے گذر رہا ہے۔

یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ جدید افسانہ نگاروں نے جدت کے نام پر افسانے کو عروج دینے کے بجائے زوال پذیر بنا دیا تھا۔ افسانے کے لئے کچھ بنیادی خوبیوں کا ہونا لازمی ہے۔ مثلاً کوئی بھی افسانہ 'پلاٹ' 'کردار' 'مکالمہ' اور 'بیانیہ' کے بغیر مکمل طور پر افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ جدید افسانے کا اگر ہم مطالعہ کریں تو ہمیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ان کے افسانوں میں سرے سے یہ خوبیاں موجود ہی نہیں ہیں اور یہی واحد سبب تھا کہ جدید افسانہ طویل نثری نظم بن کر رہ گیا۔ مثلاً "بلراج مینرا کی کمپوزیشن سیریز"۔

نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے ایک بار پھر افسانے میں معنویت کی تلاش کی ہے اور اب کہا جا سکتا ہے کہ آج کے اردو افسانے میں معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ معنی پلاٹ میں بھی ہیں اور کردار میں بھی، مکالموں میں بھی ہیں اور انداز بیان میں بھی اور یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کا اردو افسانہ ایک بار پھر اپنی تکمیل کا سفر طے کرنے میں سرگرم عمل ہے۔

جہاں تک اپنے افسانوں کے سلسلے میں میرا اپنا رویہ رہا ہے وہ یہی ہے کہ میں نے جو کوئی بھی پلاٹ یا کردار کا انتخاب کیا ہے تو اس کا مرکزی خیال کسی نہ کسی معنی کو اجاگر کرتا ہے بے معنی نہیں ہے۔ مکالموں میں بھی میری یہی کوشش رہتی ہے کہ معنی آفرینی برقرار رہے میرے مکالمے سیدھے سپاٹ کبھی نہیں ہوتے اگر

ان پر سنجیدگی سے سوچا جائے تو معنی و مفہوم ضرور ملیں گے۔ جہاں تک زبان و بیان کی بات ہے میں نے اپنے انداز بیان کو سادہ ہنے اور اثر انداز بنانے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ اب یہ افسانے قارئین پر کتنا اثر چھوڑتے ہیں یہ تو وہ خود ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

مجھے یہ دعویٰ قطعی نہیں ہے کہ میں دور حاضر کا کوئی بہت بڑا افسانہ نگار بن گیا ہوں۔ لیکن اس سفر میں میری یہ خواہش ضرور ہے کہ آئندہ نسل جب میرا کوئی افسانہ پڑھے تو اسے وہ بے معنی نہ لگے یہی افسانہ لکھتے وقت میری کوشش رہتی ہے۔ یہ کوشش مجھے کن منزلوں سے ہم کنار کرے گی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا فی الحال میں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ میرا افسانہ دور حاضر کی معنویت کا 'افسانہ' ہے ان میں چھپی معنویت کو سنجیدگی سے سمجھ لیا گیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ جو کچھ بھی میں نے سچے دل سے محنت کی ہے وہ کار آمد ثابت ہوئی ہے رائیگاں نہیں گئی ہے۔

میں اپنے کرم فرما ڈاکٹر یونس اگاسکر' جناب انور خان' ڈاکٹر رام پنڈت' ایم مبین' قاسم ندیم' اصغر حسین قریشی' ذال قاف' جاوید ندیم' **سلیم شہزاد**' رؤف صادق اور ابراہیم اشک صاحبان کا شکر گذار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میری کہانیوں پر اپنے تاثرات قلم بند کئے' مجھے زرین مشوروں سے نوازا اور قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔

منظر سلیم

○○

دیمک

سورج نے اپنی کرنوں کے قالین کو لپیٹا اور سمندر میں دفن ہوگیا۔ بستی پر تاریکی کی چادر تن گئی تھی، اور چاروں سروں پر سناٹا آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا نہ کوئی آہٹ تھی اور نہ آواز۔ درخت اندھیرے میں ننگے کھڑے تھے۔ بلبوں سے روشنی غائب ہوگئی تھی۔ وقت کا رقاص کسی تھکے ماندے اور شکست خوردہ مسافر کی طرح بڑی آہستگی سے ادھر ادھر چکّر کاٹ رہا تھا۔ وقت نے حالات کے چہرے پر گرد مل دی تھی اور دور تک دھندلاہٹ تھی۔ ایسے میں جب رات ان کے گھروں میں بن بلائے مہمان کی طرح داخل ہوئی تو پہلے مکانوں کی کھڑکیاں بند ہوئیں اور پھر دروازے۔ - - - - دروازے اور کھڑکیاں اس قدر مضبوطی سے بند کیے گئے تھے کہ اندر کا منظر باہر سے بالکل نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ شاید بستی کے لوگ خوف زدہ پرندوں کی طرح اپنے گھونسلوں میں دبکے پڑے تھے جیسے وہ کسی خاص واقعہ کے منتظر ہوں۔

اللہ رکھا بھی گھر میں بند اپنے اہل و عیال کے ساتھ بیٹھا اس کی آنکھوں سے اک ان جانا خوف جھلک رہا تھا۔ شاید وہ اپنے سر پر ایک وزنی چٹان کا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ اپنے ناتواں کندھوں پر تاریکی کی چادروں کا گٹھا لیے گھر میں داخل ہوا تھا اور پھر اندر ہی اندر اترتا چلا گیا تھا۔ مگر اس کے اندر کا تو سب کچھ کب کا بکھر گیا تھا۔ اس کی بیوی ٹکٹکی باندھے چپ چاپ اسے گھور رہی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے شوہر کے کرب سے واقف ہو۔ اس کے دونوں بچے منّا اور بے بی اتنی رات گئے تک جاگ رہے تھے۔ اور اپنے باپ کو سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی بوڑھی ماں جس کی کھانسی سے سارا گھر گونج اٹھتا تھا۔ چپ بیٹھی تھی۔ جوان بہن کی نظریں بھی اسی پر مرکوز تھی۔ ریٹائرڈ باپ ایک کونے میں آنکھیں بند کیے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ادھر اللہ رکھا کوشش کے باوجود بھی اونگھ نہیں پارہا تھا گھر میں دودھیا بلب تیز روشنی پھینک رہا تھا۔ رات میں بھی دن کا سماں تھا۔ یا رات اندر داخل ہونے کے بعد دن میں تبدیل ہوگئی تھی' سارے گھر میں کرفیو زدہ سناٹے کی حکمرانی تھی۔

اللہ رکھا بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یہ آواز کیسی ہے؟

"کیا کوئی کتا بھونک رہا ہے؟" باپ نے فکرمندانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بابا! یہ آواز کسی کتے کے بھونکنے کی نہیں بلکہ آدمی کے رونے کی ہے"

"نہیں" بیوی نے جلدی سے کہا "سائرن کی آواز ہوگی' پولس شہر میں گشت کر رہی ہے۔"

"نہیں! یہ آواز رونے کی ہی ہے۔ اللہ رکھا نے خود اعتمادی سے کہا۔" کل بھی یہ آواز آرہی تھی۔ لیکن آج یہ آواز بالکل ہمارے پڑوس سے آرہی ہے۔"

باپ اللہ رکھا کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا جیسے اسے اس آواز سے متعلق علم ہو۔

اللہ رکھا کی بوڑھی ماں' بیوی' بچے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور خوف زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر وہ کان لگا کر کچھ سننے لگے۔

بوڑھی ماں ''یہ آواز گھنٹی کی معلوم ہوتی ہے۔ جب سے ہم نے اپنے دروازوں سے زنجیریں کھینچ لی ہیں اور گھنٹیاں لگائی ہیں، تب سے ایسی آوازیں برابر سنائی دیتی ہیں۔''

سب سننے کی کوشش کرنے لگے۔ آواز اور بھی قریب ہوتی گئی جیسے یہ رونے والا شخص ان کے اپنے گھر میں کہیں موجود ہو۔

بوڑھا باپ بھی آرام کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا تھا اور سوچنے لگا۔ اس سے قبل بھی ایسی آوازیں روز کسی نہ کسی گھر سے آتی رہتی ہیں ضرور کوئی رو رہا ہے۔

اللہ رکھا کچھ کہنا چاہتا تھا مگر گھر والوں کے خوف زدہ نظروں کے تیر اس کے جسم میں پیوست ہوگئے اس نے اٹھنا چاہا مگر اسے لگا جیسے اس کی ٹانگیں بہت اندر زمین میں دھنس گئی ہوں اور اٹھنے کی کوشش اسے زمین میں مزید دھنسا دے گی۔

یہ کون ہوسکتا ہے جو اس قدر رو رہا ہے۔ لگتا ہے۔ درد کی شدت سے اس کا جسم پھٹا جارہا ہو۔

کون ہوسکتا ہے۔

کوئی کچھ نہیں بولا۔ خاموشی بدستور طاری رہی۔

اللہ رکھا نے کہا۔

''میں دروازہ کھول کر دیکھتا ہوں کہ آخر یہ آواز کس گھر سے آرہی ہے؟

''نہیں'' اس کی بیوی اور ماں چیخ پڑے۔

''ہم تمہیں باہر نہیں جانے دیں گے۔ اگر باہر پاگل کتا ہوگا تو؟''

''نہیں ماں! یہ کتے کی آواز نہیں ہے۔ یہ تو کوئی آدمی ہی ہے جو درد کی شدّت سے چلا رہا ہے۔ جیسے کوئی جاں بلب مریض جانکنی میں مبتلا ہو۔''

''کچھ بھی ہو۔ کتا روئے یا آدمی۔ ہم تمہیں اس طرح باہر نہیں جانے دیں گے۔''

''مگر دیکھنا تو چاہیے کہ کون ہے۔ اس طرح روئے جانے کا مطلب؟''

باپ کی پیشانی پر فکر سلوٹیں بن کر پھیل گئی۔

"بہر حال کوئی بھی ہو ہمیں دروازہ کھول کر دیکھنا چاہیے کہ کہیں ہمارا پڑوسی تو نہیں جو درد کی شدت سے چلا رہا ہو۔ یوں بھی پڑوسی کے ہم پر بہت زیادہ حقوق ہیں انہیں ادا کرنا ہی ہوگا۔ نہیں تو روزِ محشر سخت پکڑ ہوگی۔ ہمارا پڑوسی مر رہا ہو اور ہم بے حس و حرکت بیٹھیں رہیں یہ تو ٹھیک نہیں اتنی اندھیری رات میں۔ مجھے تو لگتا ہے کوئی آفت ہوگی۔"

"نہیں! ہمیں تو دیکھنا ہی ہوگا کہ دیکھنے سے ہی سارے راز عیاں ہوتے ہیں' چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ باپ آرام کرسی سے اٹھ بیٹھا اور دونوں دروازے کی سمت بڑھنے لگے۔ ماں' بیوی' بہن اور بچے انہیں سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اللہ رکھا نے دروازہ کھولا اور وہ باہر نکل پڑے۔

باہر اندھیرا روز کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ انہیں کچھ بھی سجھائی نہیں دیا۔ وہ دونوں لڑکھڑاتے قدموں سے کچھ ڈھونڈنے لگے' باہر نکل کر انہوں نے کمرے کی ساری نحوست رات کے منہ پر دے ماری' بستی کے گھروں پر نظر دوڑائی'

اندھیرا ہی اندھیرا'

دھند ہی دھند۔

جب وہ بہت دیر تک اندھیرے میں دیکھتے رہے تب ان پر یہ عقدہ کھلا کہ چوراہے کے قریب لوگ اکٹھا ہیں' لگتا ہے بستی کے لوگ جاگ چکے ہیں۔ وہ دونوں بھی اندھیرے کا سینہ چیرتے ہوئے ان کی طرف لپکے۔ کچھ لوگ کھڑے آپس میں سرگوشیاں کررہے تھے۔ کہیں یہ بھی اسی آواز کے متعلق بات تو نہیں کررہے ہیں۔

شاید - - - -

چلو دریافت کرتے ہیں کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ وہ بڑھنے لگے۔

کون ہو؟ ادھر کون ہے - - ؟ ہم ہیں - - - اللہ رکھا اور خدابخش۔ انہوں نے جواب دیا۔

اور پھر وہ ان لوگوں میں شامل ہوگئے۔

کیا بات ہے؟ ابھی ابھی کسی کے رونے کی آواز آرہی تھی' جیسے کوئی تڑپ رہا ہو اس جانور کی

طرح جیسے ذبح کیا گیا ہو اور جس کی شہ رگ کاٹ دی گئی ہو' آخر بات کیا ہے؟ تجسس بڑھتا ہی جارہا ہے۔ کچھ پتہ تو چلے۔

ہاں۔۔۔ ہم بھی اسی لیے یہاں جمع ہوئے ہیں' یہ معاملہ کسی ایک کا نہیں ہے۔ یہ بستی کے سبھی لوگوں کا مشترکہ مسئلہ ہے' کیوں کہ آج اس گھر کا ہر فرد رو رہا ہے' چلا رہا ہے' کل اس گھر کا روئے گا۔ اور اس طرح یکے بعد دیگرے یہ سلسلہ بستی کے گھر اور ہر آدمی تک پہنچ جائے گا۔

اب مختلف سمتوں سے آوازیں آنے لگیں اور سبھی لوگ اپنے بند کمروں سے نکل کر باہر آنے لگے اور اس معاملے میں دلچسپی لینے لگے۔

آخر ماجرا کیا ہے۔ بہت سی آوازیں

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔ ''بات یوں ہے کہ ''دین محمد'' کے سر میں شدید درد ہے' اور وہ اس درد سے بے حد پریشان ہے۔ رونے کی آواز اسی کی ہے جو درد کی وجہ سے چلا رہا ہے۔''

''سر درد؟۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ اور وہ بھی دین محمد جیسا متقی شخص اس میں مبتلا ہے؟

تو دین محمد کو ساری ڈان یا اناسن دیجیے۔ کام پر چلنے لگے گا۔ کسی نے شوشہ چھوڑا۔۔۔۔

یہ مذاق کا موضوع نہیں گمبھیر مسئلہ ہے۔ یہ صرف اسی کا مسئلہ نہیں ہے' بلکہ یہ متعدی ہے۔ کل ہم تک پہنچ جائے گا۔ روزانہ کسی نہ کسی گھر میں یہ درد اپنا ڈیرہ جمالیتا ہے اور یہ لا علاج ہے۔ کوئی ڈاکٹر' حکیم' اسپیشلسٹ اس درد کو رفع نہیں کرسکا' سب تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں۔

سب نے سرد آہ بھر کر کہا آخر یہ درد کیسا درد ہے۔ صرف سر میں ہے۔ کہیں راتوں کو ہمارے گھروں کے گرد شیطان تو چکر نہیں کاٹتے۔

نہیں۔۔۔۔

شیطان تو خود اپنی اصلیت کھوتا جارہا ہے۔ اس کا سارا رنگ تو ہم انسانوں نے اپنے آپ پر چڑھا لیا ہے۔

ہمیں کچھ کرنا چاہیے کہ درد راتوں کو اٹھتا ہے اور دن میں نہیں، اور لوگ ذبح کیے جانور کی طرح تڑپتے ہیں۔

جب سورج زمین کے جسم سے رات کی چادر کھینچ لیتا اور اپنی کرنوں کا قالین بچھا دیتا تو لوگ جو رات میں دردِ سر میں مبتلا ہوتے، ناشتہ کرتے، ٹفن تھامتے، ڈیوٹی پر نکل پڑتے، عورتیں نلوں پر پانی بھرنے چلی جاتی۔، رات کا ذکر چھیڑتی، افسوس کرتی، فکرمند ہوتی کہ آخر یہ کیا بلا ہے۔ جو ان کے شوہروں اور گھر کے بوڑھوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہے۔ اب چند ہی گھر بچے تھے جہاں یہ وبا نہیں پہنچی تھی۔ ان میں سے ایک گھر اللہ رکھا کا بھی تھا۔

اور ایک دن یوں ہوا کہ اللہ رکھا گھر میں داخل ہوا، رات اندھیری ہوئی اور اس کے سر میں بھی شدید درد اٹھا، درد کی شدّت سے وہ تڑپنے لگا، چلّانے لگا جیسے کوئی کتا بھونک رہا ہو۔ بوڑھا باپ یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کیوں کہ اس نے دوسرے لوگوں کو اسی طرح تڑپتے اور بے چین ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور ہوسکتا ہے کل وہ بھی اس مرض کا شکار ہوجائے۔

اللہ رکھا اپنی ہتھیلیوں کو کٹورا بناتا اور اس میں اپنا سر رکھ دیتا، سارے گھر میں لوٹتا، وہ محسوس کررہا تھا جس طرح کانچ کا برتن زیادہ تپش سے تڑخ جاتا ہے اس کا سر بھی ایسے ہی پھٹا جارہا تھا گھر کے سبھی لوگ فکرمند تھے۔ بچے یہ منظر دیکھ کر خوف زدہ تھے اپنے باپ کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے وہ سبھی اس کا درد دور کرنے کی فکر میں تھے۔

اللہ رکھا کہتا۔

''مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری کھوپڑی کی چھت تانبے کی ہوگئی ہے، اور میرا دماغ اپنی اصلی جگہ پر نہیں ہے۔ سر پر جیسے کوئی الاؤ جل رہا ہے۔اس گرمی سے میرا دماغ ابلتے پانی کی طرح کھول رہا ہے اندر کا لاوا تانبے کی دیواریں توڑ کر باہر نکلنے کے لیے بے چین ہے۔ شاید اس کے دماغ کا برتن بھی تڑخ گیا ہو۔

وہ خوب چلاتا رہا' روتا رہا۔ بیوی یہ سارا منظر دیکھ کر رونے لگی' وہ اپنے شوہر کے قریب بیٹھ کر وکس ملتی اس کا سر دباتی مگر کوئی افاقہ نہیں ہوتا' سارا کمرہ اس کی آواز سے گونجنے لگتا' باہر سناٹا خاموشی کی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ کتا برابر رو رہا تھا یا آدمی درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔

اور اب اس بستی کے سب لوگوں کا یہ معمول ہوگیا تھا۔ ان کے سر میں درد ہوتا جو شدید ہوتا۔ وہ سب اس درد کی حالت میں بھی راتوں کو اپنی بیویوں سے سر دبواتے' وکس ملواتے ان سے لپٹ کر سو جاتے'

درد بہرحال قائم رہتا۔

رات جب کال بیل بجاتی تو وہ سبھی لوگ خوف زدہ ہوجاتے۔ اللہ رکھا بھی اسی سر درد میں مبتلا ہے' اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آخر یہ درد کیوں ہوتا ہے' وہ درد سے تڑپتا' چیختا' چلاتا ہے مگر اس معمہ کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

بیویوں نے اس سردرد کو بھگانے کے لیے تعویذ گنڈے استعمال کیے' مردوں کے بازوؤں پر تعویذ باندھے' گلے میں سیاہ ڈوری ڈالی مگر کچھ نہ ہوا۔

تب ایک دن سارے مرد' جوان' بوڑھے جلسہ بن گئے انہوں نے اپنے چہروں کا غصہ کھینچ کر مٹھیوں میں بند کرلیا اور مٹھیاں بھینچ کر ہوا میں اچھال دیں۔

مگر انہیں اس وقت سخت افسوس ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں کی مٹھیاں غائب ہوتی جارہی ہیں اور ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے غصہ ان کے چہروں سے سرک کر مٹھیوں میں آتا اور مٹھیاں غائب ہوجاتیں' وہ سب دو قدم آگے کی طرف چلتے اور چار قدم پیچھے کی طرف لوٹ آتے۔ ٹھوکر لگتی تو گر جاتے' لڑکھڑا جاتے۔ کوئی پیچھے نہیں جو سہارا دے' جو سہارا ہے وہ نظروں کے سامنے ہے مگر دکھائی نہیں دیتا۔ وہ سب مل جل کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتے تھے کہ آخر اس درد سے کیسے نجات حاصل کی جائے؟ سب سوچنے لگے اور اس جلسہ میں

ان کی نظریں ایک ایسے آدمی کو تلاش کرنے لگی جو معتبر ہو، مخلص ہو، اور ان کی صحیح رہنمائی کرنے والا ہو۔ پھر سب کی نظریں اس آدمی پر جاکر رک گئیں جو بستی کا سب سے زیادہ بوڑھا شخص تھا۔

"اب آپ ہی کچھ راہ دکھائیے کہ ہم تو سب کچھ بھول گئے ہیں، کوئی راستہ، پگڈنڈی کچھ بھی نہیں۔ ۔ ۔ ہم سب تو بس اندھے ہیں۔"

وہ بوڑھا شخص جو وہاں سب سے زیادہ معتبر اور صائب الرائے تھا، جس نے ہر کڑے وقت میں ان کی رہنمائی کی تھی۔ گویا ہوا۔

"میرے علم میں ایک ایسا آدمی ہے جس کے سر میں کبھی درد نہیں ہوا وہ آج بھی بڑے اطمینان سے ہے، اسے شاید پتہ ہو کہ درد کیوں ہوتا ہے یا اس کا علاج کیا ہے؟"

لوگوں نے کہا۔ "ہم اس سے دریافت کریں گے۔ وہ کہاں ہے اور کون ہے؟

بوڑھا کہنے لگا۔ "بات یوں ہے کہ اس بستی سے ۱۲ کلومیٹر دور جنگل میں ایک ضعیف العمر شخص رہتا ہے، ایمان کا پرندہ اس کے دل میں آج بھی مقید ہے اور جس کی پرورش وہ اپنے نفس کا خون پلا کر کرتا ہے۔ اس معاملے کی تہہ تک وہی پہنچ سکتا ہے کہ سروں میں درد کیوں ہوتا ہے۔

ٹھیک ہے۔ یہ بھی کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت سی آوازیں۔

لوگ جلوس کی شکل میں متقی بزرگ کی قیام گاہ کی طرف چل پڑے جہاں وہ مصروفِ عبادت تھے اور اس دنیا سے بے خبر بھی۔

لوگوں نے جب انہیں دیکھا تو شاید پہلی ہی بار دیکھ رہے تھے کہ وہ بزرگ جن کی داڑھی سینے پر پھیلی ہوئی تھی اور جن کی پلکوں پر برف سی جمی تھی، سفید جبہ، سر پر ٹوپی پہنے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی اور انگشتِ شہادت آسمان کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔

انہیں دیکھ کر وہ مطمئن ہوگئے۔ اور سوچنے لگے ایسا صوفی منش تو ان کے اندر بھی ہوسکتا تھا۔

مگر نہیں تھا۔

انہوں نے پہلی بار بزرگ کو دیکھا تھا اور اب سب متعجب تھے وہ سب کھلی مٹھیوں سے وہاں پہنچے تھے، ان کا درد جوں کا توں تھا، وہ وہاں کھڑے رہے اور انتظار کرنے لگے کہ بزرگ عبادت سے فارغ ہوں۔

اور پھر لمحوں کی صدیاں گزرنے کے بعد جب وہ بزرگ عبادت سے فارغ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوئے تو لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور مسرت سے جھومنے لگے۔ اب درد کا مداوا ہوگا

ان کے دماغ کا ابلتا ہوا لاوا ٹھنڈا ہوگا۔

بزرگ ان لوگوں سے مخاطب ہوئے۔

"آپ لوگ یہاں کس لیے تشریف لائے ہیں اور میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔"

اس بوڑھے نے جو اس بستی کا سب سے معتبر آدمی تھا اور سب سے آگے تھا بڑے احترام سے کہا

"اے صوفی منش بزرگ! ہم تمام سر کے درد میں مبتلا ہیں، ہماری بستی کے ہر شخص کے سر میں یہ درد ہوتا ہے۔ ہم اس کا علاج جاننا چاہتے ہیں کہ ضبط کی رسّی ہمارے ہاتھوں سے چھوٹتی جارہی ہے اور ہمیں یہ اندھے کنویں میں لیے جارہی ہے۔ بتائیے ایسا کیوں ہوتا ہے اور آخر یہ درد آپ کے سر میں کیوں نہیں ہوتا؟"

صوفی منش نے اپنی برفیلی پلکیں جھپکائیں تسبیح کے دانوں کو تیز تیز گھمایا، اپنی داڑھی کی طرف دیکھا جو ان کے سینے پر پھیلی ہوئی تھی اور پھر وہ بہت دور خلاء میں دیکھنے لگے جیسے لوگوں کے سوال کا جواب آسمان سے اترنے والا ہو، کچھ پڑھتے رہے اور بہت دیر بعد خاموشی کے سمندر میں آواز کا ایک پتھر پھینکا۔

"اے لوگو! تمہارے سروں کے درد کا علاج تو تمہارے گھروں میں بند ہے۔ تمہارے درد، مسائل اور پریشانیوں کا حل تمہیں بہت پہلے دے دیا گیا ہے۔"

لوگ تعجب سے کہنے لگے،

"گھروں میں؟"

"ہاں۔ ۔ ۔ ۔ ایک بہت پرانی کتاب ہے جس میں اس درد کی دوا ہے جسے تم نے صدیوں سے طاق پر رکھ چھوڑا ہے اور گرد کے حوالے کردیا ہے۔"

صوفی بزرگ کی بات پر وہ چونکے اور ان کے اندر پتہ نہیں کتنی کتابوں کے ورق پرندوں کی طرح پھڑپھڑانے لگے اور پھر وہ ایک نیا کرب لیے ہوئے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے۔ انہوں نے دیکھا وہی کتاب جس کا ذکر صوفی منش نے کیا تھا۔ آج بھی ان کی طاقوں پر سجی ہوئی ہیں اور گرد سے اٹ گئی ہے۔

پھر انہوں نے گرد صاف کی، اس کتاب کو بوسہ دیا، سینے سے لگایا، آنکھوں سے مس کیا کہ بس اس کتاب میں ہی کہیں ان کے درد کا مداوا پوشیدہ ہے۔ اسے کھول کر پڑھنے کا ارادہ کیا تاکہ سردرد کا علاج مل سکے۔

اس سے پہلے کہ ان کے درد کا علاج انہیں ملتا، تعجب اور حیرت کی چٹانیں ان پر آگریں، کیوں کہ اس کتاب کے ہر ورق کو کچھ نہ کچھ دیمک چاٹ گئی تھی۔ وہ پہلے صفحہ کے کچھ اقتباس دوسرے صفحہ کے کچھ اقتباس سے جوڑتے مگر سب بے ترتیب ہوجاتے۔

آخر انہوں نے اپنے گھروں میں رکھی ساری کتابیں جو گرد سے اٹ گئی تھیں، دیکھ لیں تاکہ ان کتابوں میں شاید کہیں کچھ ذکر ملے جو اقتباسات باقی بچے تھے ان کے معنی انہوں نے تلاش کیے مگر انہیں کچھ نہ ملا۔ ۔ ۔ ۔

وہ بڑی دل جمعی اور احترام سے ان اقتباسات کو پڑھتے ہیں مگر سمجھنے سے قاصر ہیں ان کے پاس ان کے اپنے درد کا علاج آج بھی موجود ہے مگر اس کی ترکیبِ استعمال انہیں معلوم نہیں ہے۔

OO

دستک

وہم میرا ہو یا تمھارا۔ پھر بھی وہ وہم سب کا ہے۔ مجھے کیا ہوا؟ اچھی خاصی ہوں۔ ۔ ۔ پھر یہ دستک کیوں سنائی دیتی ہے؟ اور اگر سنائی دیتی ہی ہے تو دستک دینے والا دروازے پر کیوں نہیں ہوتا ہے؟

اور پھر لڑکی پھولوں کی طرح نرم نرم بستر سے اٹھ بیٹھی۔ ساری کی شکنوں کو صاف کرنے لگی۔ بلاؤز کا ہک لگا، ساری کو کس، اور بالوں کے جوڑے کو باندھنے لگی تھی۔ قد آور آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر جوانی سے بھرپور جسم پر نظر ڈالی بدن مسکرانے لگا۔

اس نے دروازہ کھولا۔ باہر دیکھا کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ کوئی ہے ہی نہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔ مگر ہے کیوں نہیں؟۔۔۔ اگر نہیں ہے تو ہونا چاہیے؟

اور پورے یقین کے ساتھ پھر وہ اندر چلی گئی۔

لڑکی کا باپ اپنی جوان بیٹی کے شباب اور بے چین نگاہوں پر ایک نظر ڈالتا ہے——اور کہتا ہے——

''بیٹی۔ کیا آج پھر ---- دروازے پر ----

''ہاں پتاجی! دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا جارہا تھا--- میری نیند ہی ٹوٹ گئی میں اپنے آپ سے باتیں کررہی تھی۔ دستک نے وہ سلسلہ توڑ دیا پتا نہیں کون تھا؟

''نہیں بیٹی یہ تمہارا وہم ہے۔ کوئی نہیں ہوتا ہے۔ آنے والے بغیر دستک دیے آجاتے ہیں۔ یہاں پر کوئی اجنبی نہیں آتا۔ سبھی جانے پہچانے اور اپنے ہی آتے ہیں''——

''پتاجی! میرا مَن کہتا ہے کہ ضرور یہ ہمارا اپنا ہی ہوگا۔ جو اندر آنے کے لیے دستک دے رہا تھا۔

''ارے بیٹی—— تم ایک دم بھولی ہو' باہر سناٹا ہے اور اس کڑاکے کی سردی میں کوئی باہر کیسے گھوم رہا ہوگا۔ مرنا ہے جو گھومے گا؟ —— یہ تمہارا وہم ہے——!''

''وہم میرا ہو یا آپ کا۔ وہم ہم سب کا ہے۔

بہرحال کوئی دستک ضرور دیتا ہے ہمارے دروازے پر کوئی آتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے—— نہ جانے کیوں؟ رات میں چاند جب اپنے شباب پر ہوتا ہے میں اس دستک کی آواز سنتی ہوں۔ میرے کانوں میں ابھی تک کھٹ——کھٹ کی وہ عجیب آواز گونج رہی ہے''

''نہیں بیٹی تمھارے کان بج رہے ہوں گے۔ یہ تمہارا وہم ہے۔ تم اب سوجاؤ۔ لیکن میں دستک بھی تو سنتی ہوں—— تم سوجاؤ——''

''ہاں میں سوتی ہوں۔''

پھر دروازہ کھلنے کی آواز ——کھٹ ——کٹ ——کٹاٹ ——کون ہے؟ اتنی رات گئے؟—— اور کون ہوسکتا ہے؟

لڑکی کے پتا جاگ جاتے ہیں——''

"یہ دروازہ کیوں کھولا ——کیا پھر؟ ——"

"ہاں—— پھر وہی دستک۔"

اور وہ صحن میں کھڑے ہو کر باہر نظر دوڑاتی ہے تارکول کی لمبی سڑک اور بجلی کے کھمبے—— سنسان رات۔

"پتاجی!—— "میں سوچ رہی تھی کہ یہ دستک ضرور بڑے بھیا نے دی ہوگی۔ آج کل انھیں آفس سے آنے میں بہت دیر ہوجاتی ہے۔ جب سے "ریل روکو" راستہ روکو"۔ اور اسی طرح کی دوسری ہڑتالیں اور تحریکیں چلنے لگی ہیں۔ تب سے وہ راتوں کو بہت دیر سے آتے ہیں۔ جب دستک میرے کانوں میں گونجی تو میں سمجھی ضرور بڑے بھیا ہوں گے۔"

"لیکن یہ بھی تمہارا وہم ہے—— تمہارا بھائی تو کب کا آفس سے آگیا ہے۔ اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔"

"کیا —— ہاں —— بھیا تو کب کے آگئے دروازہ لتا نے کھولا تھا۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر دستک——"

"سوجاؤ نیند آرہی ہے تمھیں —— جاؤ سوجاؤ ——"

"میں سوتی ہوں —— میں سوجاؤں گی۔ میں جاگنا بھی چاہتی ہوں۔ —— نہیں —— لیکن جو دروازے پر دستک دیتے ہیں وہ انتظار بھی نہیں کرتے کہ دروازہ کھلے گا —— کوئی —— ان کا سواگت کرے گا۔

پھر دروازہ کھلنے کی آواز —— کھٹ —— کٹ —— کون ہے؟

"ارے بیٹی تم —— پھر جاگ گئی؟"

"ہاں پتاجی —— وہ دستک ——"

"یہ تمہارا وہم ہے بیٹی"

"دستک کی آواز سن کر میں نے سوچا شاید راجو گھر آیا ہو—— وہ آج کل بہت آوارہ

ہوگیا ہے۔ دن میں کالج جاتا ہے اور راتوں کو آوارہ گردی کرتا ہے—— کہیں وہ تو نہیں——؟''

''بیٹی وہ تو آج بہت جلد آکر سوگیا ہے۔''

''شہر میں ہنگامے شروع ہیں—— راتوں کو گھومنا ٹھیک نہیں —— وہ خود ایسا کہہ رہا تھا۔ دیکھو وہ سویا ہے —— اور تمہاری ممی نے ہی تو دروازہ کھولا تھا''——

''مگر مجھے دستک کیوں سنائی دیتی ہے؟''

''تمہارے کان بجتے ہیں —— کسے اتنی فرصت؟ —— اس دور کا آدمی اتنا مصروف ہے کہ اسے خود پتا نہیں کہ وہ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ —— اور کیا نہیں؟ —— کہاں جاتا ہے؟—— کہاں نہیں جاتا ہے؟ اور کہاں تک جائے گا؟ —— بڑی کشمکش سے پُر زندگی ہے آج کے انسان کی —— وہ تو صرف خلا میں دوڑنے لگا ہے۔ بیٹی وہ بے انتہا مصروف ہے دستک دے نہیں سکتا۔ وقت کی زنجیر ہلانے کے لیے اس کے پاس چند ہی گھڑیاں باقی ہیں —— سوجاؤ —— دستک کہاں ہے—— کون دستک دے گا —— سوجاؤ——''

''ہاں میں سوجاؤں گی —— ہاں میں سوتی ہوں۔''

''چلو —— اپنے بستر پر —— اس طرف ——''

ایک بار پھر دروازہ کھلنے کی آواز ——

''کون ہے؟ کوئی نہیں —— کون ہے دروازے پر؟'' ——

''میں ہوں ماتا جی! ——''

''ارے بیٹی —— تم پھر جاگ گئیں؟ —— کیا ہوا؟''

''ماں پھر وہی دستک —— دروازہ کھٹکھٹانے —— پتا نہیں کون ہے جو دروازہ کھٹکھٹاتا رہتا ہے۔''

''ارے بیٹی آنے والے بغیر دستک دیئے آجاتے ہیں۔ جانے والے بغیر دروازہ کھولے

چلے جاتے ہیں۔ یہ تمہارا وہم ہے۔ کوئی دروازے پر نہیں ہوتا ——''

''ماں وہم میرا ہو یا آپ کا۔ وہ ہم سب کا ہے۔ تم خود سنو دستک کی آواز۔''

''جاؤ سو جاؤ—— اپنے بستر پر —— اپنے کمرے میں چلی جاؤ لوگوں کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ دستک دیتے رہیں —— جاکر —— سو جاؤ میں بھی سوتی ہوں'' ——

''لیکن دستک کی آواز سن کر میں نے سوچا کہ شاید پتا جی آئے ہوں۔ وہ پونا گئے ہوئے ہیں نا۔''

''تمہارے پتاجی پونا گئے ہی نہیں۔ کیونکہ آج بمبئی کے ہنگامے تیز ہوگئے ہیں۔ وہ تو کب کے سو گئے۔ مگر تم ان کا انتظار کیوں کرنے لگی ہو؟ میں جو ہوں —— میں ان کے لیے جاگتی ہوں اور ان کے لیے سوتی ہوں اور ان کی دستک کی آواز پر بستر چھوڑ دیتی ہوں۔ جاؤ تم سو جاؤ۔''

''ماں —— میں سو جاؤں گی۔ نرم نرم مخملی بستر' جس پر گلاب سجے ہوئے ہیں اور خوشبو سے معطر ہے۔ اور میری ہی طرح اکیلا ہے۔ ایک دم تنہا —— اور پتا نہیں کب تک رہے گا۔ میں اسی بستر پر سو جاؤں گی کیوں کہ مجھے سونا ہے۔'' اور وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو جو مکڑی کے جالے کی طرح بکھری ہوئی ہیں دیکھتی ہے۔ مگر اس کی ہتھیلی ایک دم صاف ہو چکی ہے۔ وہاں کوئی لکیر ہی نہیں ہے پھر بھی اسے دستک ——

پھر دروازہ کھلنے کی آواز ——کھٹ ——کٹ ——کٹاٹ ——

''کون ہے؟''

''ارے بیٹی تم سوئی نہیں۔ ابھی تک جاگ رہی ہو؟''

''ہاں۔ ماں جی! پھر کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔''

''ارے تم تو بڑی پاگل ہو—— میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔ دستک کی —— کہاں۔ کوئی بھی تو نہیں —— جاؤ سو جاؤ —— یہ تمہارا وہم ہے۔''

''وہم میرا ہو —— کسی کا ہو۔ ہم سب کا ہے۔ وہ ہم سب کا ہے۔''

اور پھر یوں ہوا کہ اب دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا جارہا تھا۔ گھر کے سبھی افراد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ یہ دستک ——

دروازہ ——

دستک ——

سب کے سب متحیر انداز سے ایک دوسرے کے چہرے پڑھنے لگے۔ جو ایک دم کورے کاغذ کی طرح تھے۔ ماں کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ باپ صرف مسکرانے کی کوشش کررہا تھا۔ بھیا اس لیے مسکرا رہے تھے کہ بھابی بھی مسکرا رہی تھیں۔ اور پھر وہ باری باری ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے سب کے سب اپنے چہروں پر مایوسی اور امید کی ملی جلی کیفیت لیے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی سرخی یہ بتارہی تھی کہ وہ بہت خوش ہیں۔ اور شاید وہ سب پہلی بار اتنا زیادہ خوش ہوئے تھے۔ اس سے پہلے تو وہ سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ مگر ان کو ہنسنے یا خوش ہونے کے مواقع کم ملے تھے۔

دراصل دستک کی آواز نے سارے گھر میں شور پا کر دیا تھا۔
کیونکہ وہ کئی برسوں بعد اس آواز کو سن رہے تھے۔
کوئی آنے والا آیا تھا جو دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اور بہت زور زور سے ——
مگر اب لڑکی گہری نیند سو رہی تھی ——
اس ہنگامے سے بالکل بے خبر ●

الاؤ اور ایک بوڑھا شخص

وہ سب تعداد میں کتنے تھے کہ ٹھیک سے پتہ نہیں ہے۔ مگر وہ جتنے بھی تھے انھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا تھا۔

برسوں سے وہ ایک دوسرے کو انگلیوں پر گنتے آئے تھے اور ان کی گنتی میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ان سب کے درمیان وہ ایک بوڑھا شخص بھی موجود تھا۔ جس کی داڑھی برف تھی اور آنکھوں کی شمعیں موٹے فریم کی عینک کے پیچھے برابر جل بجھ رہی تھیں۔ وہ ان سب کے درمیان بیٹھا تھا۔ مگر کافی متفکر و متجسس لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھری جھریوں میں غموں کی داستان چھپی ہوئی تھی۔ شدت کی سردی میں بھی وہ اپنے کمزور ہاتھوں میں دونالی بندوق تھامے اس الاؤ کے قریب بیٹھا تھا جہاں اور دوسرے لوگ بھی بندوقیں تھامے آگ تاپ رہے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب شہر میں بد ترین قسم کا فساد ہوا تھا اور آگ دوکانوں،

مکانوں سے ہوتی ہوئی الاؤ تک اور الاؤ سے ان کے اندر بہت اندر تک اتر چکی تھی۔ وہ سب اس الاؤ کے قریب بیٹھ کر اپنے علاقے کی حفاظت کر رہے تھے۔

بندوقیں تھامے۔ حالانکہ شہر میں مکمل طور پر ایس آر پی کا بندوبست کیا گیا تھا اور جب ایس آر پی بھی حالات پر قابو پانے میں ناکام ہوگئی تو پھر شہر کو فوج کے حوالے کرنا پڑا تھا مگر احتیاطاً وہ سب اپنے علاقے کی حفاظت کی غرض سے کالونی کے درمیان گراؤنڈ میں الاؤ کے گرد اکٹھا تھے ------ وہ بندوقوں کے ہتھوں پر ہاتھ پھیرتے، اسے سہلاتے، چاروں سمت میں ان کی بے چین نظروں کے تیر سفر کرتے۔ ذرا سی آہٹ پر وہ چونکتے اور حملہ آوروں کی چالوں کو ناکام بنانے کی پوزیشن میں آجاتے۔

حملہ آور کسی بھی سمت سے آئیں گے اور ہمارے محلے تہس نہس کر کے گزر جائیں گے۔ اس لیے جاگنا ضروری ہے اور جاگنے کے لیے ہمیں ہر حال میں الاؤ کی آگ کو اپنے ندر بھرنا ہے۔ یہ وہ جانتے تھے۔ پتہ نہیں وہ کتنے برسوں سے الاؤ کے گرد اس طرح بیٹھے تھے۔ سردی کی شدت نے اور اپنے علاقے اور خود کو بچانے کے تناؤ نے ان کے اندر آگ کو مزید بھڑکا دیا تھا جسے وہ محسوس کر رہے تھے۔

------ آگ جو کہ شہر میں لگی تھی۔

------ آگ جو الاؤ کے اندر تھی۔

------ آگ جو کہ ان کے اندر تھی۔

رات تاریک تھی اور شہر میں کرفیو۔

خوف کسی زخمی پرندے کی طرح ان کے اندر سرایت کر رہا تھا۔ بندوقیں، جو ان کے پاس تھیں۔ ان کے آبا واجداد نے بطورِ ورثہ ان کے حوالے کی تھیں۔ جسے وقتِ ضرورت وہ استعمال بھی کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی جب شہر چھوٹا موٹا جلیان والا باغ بن جاتا تو وہ ان بندوقوں کا آزادانہ استعمال [illegible]تے۔

برسوں سے وہ ا[illegible]ی کر رہے تھے۔ بوڑھے شخص نے ان تمام سے اعتماد کا ووٹ بھی

حاصل کرلیا تھا۔ وہ سب اس پر اندھا، اعتماد رکھتے تھے۔

وہ ان کی رہنمائی کر رہا تھا، انھیں مناسب مشورے بھی دے رہا تھا۔ جب کوئی سونے لگتا تو وہ جاگنے کا سامان بن جاتا——

''دیکھو سونا نہیں، جاگو۔ ـ ـ ـ ـ ـ جاگو! آج ان حالات میں نیند کا خمار ہماری آنکھوں سے دور رہے تو بہتر ہے۔ اگر ہم سوگئے تو کبھی نہ جاگیں گے اور یہ محلہ حملہ آوروں کی زد سے نہ بچ سکے گا۔ اسی لیے یاد رکھو سونا نہیں—— میں تم کو تمہارے آباؤ اجداد کی داستان سناتا ہوں۔ ہمارے اسلاف کی کہانیاں جو تم میں جوش بھر دیں گی۔ اور یہ رات صبح کی طرف بڑھے گی۔ ٹھیک ہے نا!''

بوڑھا نحیف آواز میں کہانی شروع کرتا ہے ———————

''پھر یوں ہوا کہ ہمارے اجداد نے اس ملک پر کئی حملے کیے۔ مندروں کو لوٹا، مسجدوں کو ویران کیا۔ ظلم و ستم کی حد کردی اور کمزوروں پر جبر کیا۔ تلوار کی دھار پر انھوں نے حکومتیں بدل دی تھیں۔''

''مگر'' درمیان میں ہی کوئی ٹوک دیتا ہے۔ ''یہ تو بہت پرانی داستان ہے۔ کوئی نئی چیز سناؤ۔''

''نئی چیز!''

''یار یہ بوڑھا بور کر رہا ہے۔ اس کے پاس گھسی پٹی داستانیں ہیں، ان حکومتوں اور حملوں سے بھلا ہمیں کیا لینا دینا۔ کیا یہ داستان سننے کے بعد ہمارے اندر آگ بڑھ جائے گی۔ کیا الاؤ اور بھڑک اٹھے گا؟

شاید۔ ـ ـ ـ ـ ـ نہیں!

ان تمام لوگوں نے اس بوڑھے شخص کو یہ اطمینان دلایا تھا کہ وہ اس کی رہنمائی میں جواں مردی سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے علاقے کا تحفظ کریں گے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ مخصوص قسم کی آواز نے ان سب کی سوچوں کو منتشر کردیا۔

جوتوں کی ٹپ ٹپ نے ان کے اندر خوف کو مزید بڑھا دیا۔ اور ان سب کو خاموشی کے عمیق سمندر میں لا پھینکا۔

اور پھر ——— وہ داستان سے نکل کر واپس اپنے ماحول میں آگئے جہاں کرفیو کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹے کو تارکول بچھا دیا گیا تھا۔ قبر نما گھروں میں مقید ان زندہ لاشوں کے متعلق وہ سوچتے اور کفِ افسوس ملتے۔ چرمی جوتوں کی آوازیں ان کی سوچوں پر مسلسل ہتھوڑے برسا رہی تھی اور وہ سب خاموشی کے الاؤ میں لفظوں کی خشک لکڑیاں ڈال رہے تھے۔ لکڑیاں بھر بھر جلنے لگتیں اور دھواں آسمان کی وسعتوں میں کھو جاتا بکھر جاتا——————

''مجھے تو نیند آ رہی ہے۔'' کوئی ایک کہتا ہے۔

''نہیں، سونا نہیں ———— شاید ہم بہت سو چکے ہیں۔ ---- شاید ہم کبھی جاگے ہی نہیں۔ --- اگر آج ہم سو گئے تو کبھی جاگنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ ---''

''میں تمہارے جاگنے کا سامان کرتا ہوں۔'' بوڑھا پہلو بدل کر کہتا ہے۔ ''میں تمہیں ایک نئی کہانی [illegible] جو برسوں پرانی روایت پر مبنی ہے۔''

بوڑھا کہانی شروع [illegible] ہے

''کہانی تو یہ اس ملک کی کہانی ہے۔ جہاں پر لوگ غلام پیدا ہوتے ہیں اور غلام مر جاتے ہیں۔ جن پر حاکم اپنے ظلم کے چابک سے تشدد پھیلا کر حکومت کرتے ہیں۔ ——— ایک بار جب انھوں نے غلامی کی زنجیر توڑنے کی ایک چھوٹی سی کوشش کی تھی ——— تو انھیں حاکم وقت نے اپنے کرودھ کی گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ ایک میدان میں عوام کو چاروں طرف سے گھیر کر گولیاں برسائی گئی تھیں۔ اور بھگدڑ میں لاتعداد لوگوں نے کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی۔

''یار یہ شخص واقعی بور کر رہا ہے۔ اسے ایسی بکواس کہانیوں میں کیا لطف آتا ہے۔ یہ کوئی نئی کہانی کیوں نہیں سناتا۔ بھلا ایسی کہانیوں سے ہمارے اندر کیا تبدیلی ہو سکتی ہے۔

------ ''

بوڑھا چپ سادھ لیتا ہے۔ اپنی بے چین نگاہوں کو دور خلا میں گاڑ دیتا ہے۔ پھر وہ اپنی بندوق سہلاتا ہے۔ خشک لکڑیاں الاؤ میں ڈالتا ہے اور اپنے اندر کی آگ تیز کر دیتا ہے۔

ایک بار پھر کوئی اس کی سوچ کے سلسلے کو منقطع کر دیتا ہے۔

''بیڑی ہے تمہارے پاس ----- ''

''ہاں --- ہے اونٹ بیڑی --- کیوں اسماعیل بیڑی نہیں پیتے --- ''

''نہیں، میرے خاندان میں سبھی لوگ اونٹ بیڑی پیتے ہیں --- ''

ٹھیک ہے دینا ذرا ایک بیڑی ------ ''وہ شخص بیڑی کے لمبے لمبے کش لیتا ہے اور دھواں فضا میں چھوڑ کر کہنے لگتا ہے ------ ''پھر کیا ہوا؟''

بوڑھا شخص جو ان تمام لوگوں کو کہانیاں سنا کر جگانا چاہتا تھا وہ بخوبی محسوس کر رہا تھا کہ ۔ ایک آدمی شاید سب کو سلا دے گا اور سب کی موت کا ذمہ دار بھی یہی ہوگا۔ آخر اس شخص کو نیند کیوں آ رہی ہے اور یہ جاگنا بھی نہیں چاہتا ------ ؟ آخر اسے ہوا کیا ہے --- ؟ بوڑھے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ اس شخص کی حرکات و سکنات کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا اور اس آدمی پر اس کی بے چین نظریں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ''اتنی شدت کی سردی ہے اور تمہیں نیند آ رہی ہے۔ الاؤ کے قریب بیٹھ کر بھی کوئی سوتا ہے۔ نیند کا بوجھ تمہیں برباد کر دے گا۔ لیکن پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس سے قبل شاید برسوں پہلے ایسا ہوا ہو۔ ویسے بھی ہم برسوں سے اس الاؤ کے گرد بیٹھتے ہیں۔ آگ کے شعلوں کو دیکھ دیکھ کر اب ہماری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ اس آگ سے ہم مانوس ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمیں الاؤ کے قریب بیٹھ کر سو جانا چاہیے کیوں کہ اب تک کسی نے بھی حملہ نہیں کیا۔ نہ دشمنوں نے نہ پولس نے پھر خواہ مخواہ ہم اس سردی کا مقابلہ کیوں کریں۔ ہماری بندوقوں کی نالیوں میں شاید زنگ لگ جائے یا پھر وہ الاؤ کی گرمی سے پگھل جائیں گی۔ اور ہم بیٹھے بیٹھے سردی سے سکڑ کر موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔''

"میں تمہیں سونے نہیں دوں گا۔ نئی کہانی سناؤں گا اور تم سب کو جاگنے پر مجبور کروں گا"

بوڑھا اپنی بندوق کے ہتھے کو مضبوطی سے پکڑتا ہے اور کہانی شروع کرتا ہے۔

"کہانی اس شہر کی ہے' جہاں آزادی کے بعد سے آج تک دو بڑے بھیانک فساد ہوئے۔ دوسرے فساد میں ۲۸ بے گناہ لوگوں کو آگ میں زندہ جھونک دیا گیا تھا۔ اسی فساد نے شہر بھر میں ایک عجیب قسم کا خوف مسلط کر دیا تھا جو آج تک قائم ہے۔ کہانی بہت زیادہ پرانی نہیں ہے۔

——— شاید کل کی ہے۔

——— شاید آج کی ہے۔

——— شاید ابھی کی ہے۔"

کہانی ابھی اختتام تک نہیں پہنچی تھی کہ پھر درمیان میں ہی کسی نے بوڑھے شخص کو ٹوک دیا تھا۔

"فسادات پر کہانیاں اب بور لگتی ہیں۔ ایسی کہانیاں سننے سے بہتر ہے کہ آدمی سو جائے۔ ایک بھرپور نیند۔ اور پھر تم ایسی کہانیاں سنا کر کون سے نتائج برآمد کرنا چاہتے ہو۔ آبا واجداد کی کہانیوں کے نام پر تم ہمیں گمراہ کر رہے ہو۔ ایسی داستانیں' ماضی کی کہانیاں۔ ایک ڈھکوسلا ہیں صرف اپنے آپ کو خوش رکھنے کا اور خوش فہمی کا ایک عفریت ہے جو برسوں سے ہمارے تعاقب میں ہے۔"

اس آدمی کی باتوں اور ریمارکس نے بوڑھے کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

بوڑھا شخص جو اپنے ناتواں ہاتھوں میں دو نالی بندوق تھامے الاؤ کے گرد بیٹھا ہے خوب جانتا ہے کہ یہ سب لوگ جو سونا چاہتے ہیں۔ فسادات کے نتائج کا انھیں اچھی طرح علم ہے پھر بھی وہ ان کی معلومات کو تازہ کرنا چاہتا تھا اور وقت گزارنے کا اس سے اچھا طریقہ اس

کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا تھا۔

اس سے قبل وہ تاش کھیل چکے تھے۔ اپنی اپنی بازیاں ہار چکے تھے۔ وہ شطرنج کھیل چکے تھے اور حکومتیں ہار چکے تھے۔ اپنی اپنی کہانیاں سنانے کے بعد وہ ایک دوسرے کی زندگی کے اندھیرے کمروں میں جھانک چکے تھے۔ اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ شاید وہ خود بھی اپنے پاس نہیں بچے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو بھی خرچ کردیا تھا۔ اب سوائے اس کے کہ وہ بوڑھے شخص سے سنی سنائی کہانیاں سنیں۔ اس شخص کے حق میں یقین و اعتماد کا ووٹ ڈالیں اور ان کہانیوں پر ایمان لائیں کوئی چارہ نہیں تھا۔

وہ شخص ان کی فطرت سے بخوبی واقف تھا کیوں کہ وہ خود بھی ان میں سے ہی تھا۔ اس نے پتہ نہیں کتنے جلیان والا باغ دیکھے تھے۔ کتنے میرٹھ و بھاگل پور بھوگے تھے۔ وہ ان سے بڑے اعتماد کے ساتھ کہتا کہ سونے سے کبھی جاگنے والوں کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ بلکہ جاگنے والے ہی قوموں کی تقدیریں بدل دیتے ہیں۔ اس لیے ہمیں جاگنا ہے۔ اور بندوقوں پر گرفت مضبوط رکھنا ہے۔ پھر وہ سب اس شخص کی باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے اپنی بندوقوں کے ہتھوں کو مٹھیوں تلے دباتے سینے سے لگاتے اور الاؤ میں خشک لکڑیاں ڈالتے۔ لکڑیاں بھر بھر جلنے لگتیں۔ ان کے اندر کی آگ بھی تیز ہوجاتی۔

ان میں سے کوئی ایک بوڑھے شخص سے مخاطب ہوتا ''ہاں تو پھر کیا ہوا؟''

بوڑھا سوچنے لگتا کہ کوئی تو ہے جو دلچسپی کا مظاہرہ کررہا ہے۔ پھر بوڑھا مخاطب ہوتا۔

''میں تمہیں اب ایک نئی کہانی سناؤں گا۔ ایک دم نئی جسے تم نے نہ سنا ہوگا اور نہ ہی دیکھا ہوگا۔ کیوں کہ تم تک وہ کہانی پہنچ نہیں پائی ہے۔''

ہیں۔ ''ہاں تو ضرور سناؤ ایسی نئی کہانی——؟''

بوڑھا شخص کہانی شروع کرتا ہے۔

''یہ کہانی بستی کے ان لوگوں کی ہے جو برسوں سے گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح دو پاٹوں میں پسے جارہے ہیں اور برسوں سے وہ ان پاٹوں کے باہر نکلنے کی کوشش کررہے

ہیں۔ لیکن ناکام ہیں۔ اس بستی میں ایک نہر کے کنارے لوگوں کو لائن سے کھڑا کر کے دیش کے محافظوں نے گولیوں سے بھون ڈالا تھا——اور نہر لاشوں سے بھر دی تھی۔ یہ بالکل نئی کہانی ہے۔''

لیکن بیچ ہی میں کوئی شخص ——— یار' اس کہانی میں کوئی دم نہیں ہے۔ اور ہم کب تک ایسی باسی کہانیوں کے سہارے اپنی نیند بھگانے کی کوشش کریں گے۔ کاش نیند کا کارواں ہماری آنکھوں میں کچھ دیر ٹھہرے' پڑاؤ ڈالے۔ اور ہم اس دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی اور دنیا میں سفر کریں۔''

بوڑھا ٹھہر کہہ اٹھتا ہے۔

''آپ لوگوں نے مکمل کہانی نہیں سنی۔ اگر اس کہانی کے کچھ حصے اور سن لیتے تو شاید آپ کا یقین مجھ سے زیادہ ان کہانیوں پر ہوتا۔ جنھیں میں سنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔ اس بستی سے قریب ایک اور بستی ہے۔ جہاں پر ایک عبادت گاہ میں لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر کر پولس نے گولیاں برسائی تھیں۔ جس میں بوڑھے جوان اور بچے تھے۔ شاید اس کہانی میں تمہیں کچھ مزا آجائے۔ سنو گے یہ کہانی۔''

''نہیں ہر کہانی میں ایک جیسے کردار ہیں۔ ایک جیسے واقعات ہیں۔ ایک جیسے حالات ہیں۔ کچھ بھی تو نیا نہیں ہے۔'' سب کچھ گھسا پٹا سا ہے۔

فساد میں جو توڑ پھوڑ ہوئی تھی تو کچھ خشک لکڑیاں انھوں نے اپنے پاس جمع کر لی تھیں۔ پٹرول اور گھاسلیٹ بھی اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ اناج کپڑا اور روپیہ وہ اپنے گھر دے آئے تھے اور بندوقیں لے آئے تھے' جو ان کے آبا و اجداد نے انھیں وراثت میں چھوڑ دی تھیں۔ برسوں بعد وہ اسی طرح جمع ہوئے تھے—— ایک ہی پلیٹ فارم پر الاؤ کے گرد بیٹھ کر لکڑیوں کو ایک ساتھ جلتا دیکھ کر انھیں اپنا پچاس سال سے جلتا ہوا جسم نظر آرہا تھا۔ شاید وہ کسی گیس چیمبر میں بند تھے۔ اور اندر ہی اندر بھوک اور پیاس سے نڈھال اور عجیب سی گھٹن محسوس کرتے رہے تھے۔ اور اس گیس چیمبر سے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے

تھے۔ گھروں میں بے چین اور خوفزدہ بیویاں تھیں۔ فکر مند بوڑھے ماں باپ تھے۔ روکھے سوکھے بچے تھے اور کرفیو تھا اور اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا طویل مدت گزر جانے کے بعد انھوں نے الاؤ جلا کر روشنی کی تھی۔

''آپ کی کہانی شاید ختم نہ ہو مگر میرے صبر کی حد ختم ہو رہی ہے۔ میں آگے کی طرف کھسک رہا ہوں۔ اور دھیرے دھیرے نیند مجھ پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ پتہ نہیں آج نیند کیوں آرہی ہے؟''

''میں تو جاگنا چاہتا ہوں' مگر جاگنے سے پہلے سونا چاہتا ہوں۔''

''چائے پی لو۔۔۔''

''چائے پی چکا''

''پھر کوشش کرو کہ نیند کا لشکر تمہاری آنکھوں کے قلعے کی طرف نہ بڑھے''

''لیکن ایک سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہم لوگ کب تک اسی طرح آگ تاپتے رہیں گے۔ کیا یہ الاؤ کبھی نہیں بجھے گا۔''

''بس کچھ ساعتوں کی بات ہے پھر رات کی اس تاریکی سے ہم لوگ اجالے کی طرف بڑھیں گے۔ ایک نیا سورج اگے گا۔۔۔ اور ہمارے ذہن و دل کی تاریکی غائب ہو جائے گی۔''

''پھر کرفیو ختم ہوگا۔۔۔ اور ہم اپنے اپنے کاموں پر جائیں گے۔ کرفیو کب ختم ہوگا شاید کچھ راتوں بعد۔۔۔۔۔؟''

''کرفیو کب لگا تھا۔۔۔؟'' کوئی ایک کہتا ہے۔

''جیسے تمہیں پتہ ہی نہ ہو۔۔۔'' کوئی دوسرا کہتا ہے۔

''کیا تم نہیں جانتے جس دن شہر میں بد ترین فساد بھڑکا تھا۔ بس اسی دن سارے شہر میں کرفیو کی تارکول بچھادی گئی تھی۔''

''فساد کب ہوا تھا''

''جس دن ایک مذہبی جلوس نکلا تھا۔ اسی دن جھڑپ میں خدا بخش اور گانیکواڑ مارے گئے تھے۔ اور پھر نعرے ----- ،مسلسل نعرے---؟

کرفیو کی تارکول------

سناٹے کی دھند-------

چرمی جوتوں کی آواز------

اور گھپ اندھیرا------

''مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں ہے کہ کرفیو کتنے عرصے سے نافذ ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ جب سے کرفیو لگا ہے تب سے الاؤ جل رہا ہے اور ہم سب اس کی آگ سے اپنے جسم تاپ رہے ہیں۔ اپنے اندر آگ بھر رہے ہیں۔

''اور یہ کرفیو؟'' تیسرا پریشان ہے۔

''ہماری بندوقوں سے گولیاں نکلنے کے لیے بےچین ہیں۔ اور آگ الاؤ میں جل رہی ہے۔ اس طرف سے ابھی تک کوئی رد عمل نہیں ہوا ہے۔ نہ حملہ ہوا ہے۔ نہ فائرنگ۔ کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ نہ کوئی قتل نہ ہنگامہ اور نہ ہی فلک شگاف نعرے کچھ بھی تو نہیں۔''

سردی شدت اختیار کرتی جارہی تھی اور وہ سب ایک نئی صبح کا انتظار کر رہے تھے۔ نئے سورج اگنے کا اور نئی روشنی کا انتظار------ دوسرا علاقہ بھی اندھیرے میں تھا۔ سناٹے اور خاموشی کی دھند اسی طرف بھی چھائی ہوئی تھی۔ اور شاید ایک الاؤ ادھر بھی جل رہا تھا۔

وہ سب برسوں سے اس الاؤ کے گرد بیٹھے اپنے مورچے پر جمے ہوئے تھے تاکہ اس طرف سے کوئی دشمن نہ آسکے۔ ان دونوں علاقوں کے درمیان صرف ایک تالاب ہی حائل تھا جس کا پانی صاف و شفاف ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب اکثر و بیشتر بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو جاتا تھا۔

بوڑھے شخص نے محسوس کرلیا تھا کہ ان تمام لوگوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی۔ جو

اپنے ہتھیاروں سے بے خبر اور اپنے آپ سے لاتعلق تھے۔ بوڑھے نے انھیں جگائے رکھنے کے لیے پھر ایک کہانی سنانے کے لیے ماحول بنایا۔ اس نے کہا کہ ''میں تمھیں ایک ایسی بستی کی کہانی سناتا ہوں جہاں پر ظلم و تشدد اور درندگی کا ایک بھیانک اور ننگا ناچ کھیلا گیا۔ محافظوں نے ایک کمرے میں سیکڑوں لوگوں کو بند کرکے گولیوں سے بھون دیا اور لاشوں کو گنگا کے حوالے کردیا۔ خون میں نہائی گنگا کی کہانی ---

خونی نہر کی کہانی --- انسانی لاشوں کا بازار شاید اس سے بڑا آج تک نہیں لگا۔'' بوڑھے نے اپنی پلکیں جھپکائیں ---- اور لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو اس نے محسوس کیا کہ ان میں کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ -------- اور اس شخص کو دیکھا جو سو رہا تھا تو پھر وہ مضطرب ہوگیا۔ تبھی دور سے نعروں کی آوازیں سنائی دیں۔

''جاگو --- ! جاگو! ارے اٹھو ---- یہ وقت سونے کا نہیں ہے۔ جاگنے میں ہماری بھلائی ہے اور سونے میں شاید نقصان! -------''

بوڑھا جانتا تھا کہ دشمن اس کے بہت قریب آگیا ہے! نعروں کی آوازیں تیروں کی طرح وہ اپنے اندر دھنسی ہوئی محسوس کررہا تھا۔ چرمی جوتوں کی چرچراہٹ اس کے کانوں میں ایک شور کی طرح داخل ہورہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اب یہ سوگئے تو پھر کچھ بھی نہ دیکھ سکیں گے ---

نہ نیا سورج اور نہ نیا اجالا --- وہ چلّانے لگا ---

''اٹھو! --- جاگو --- اب سونا نہیں!''

''-------- آخر ہم کب تک برداشت کریں۔''

------- آخر ہم کب تک جاگتے رہیں گے؟

''-------- کچھ تو ہونا چاہیے ہلچل' ہنگامہ' شور اور دہشت!''

بوڑھا شخص خاموشی سے اس ایک کی باتیں سنتا ہے اور الاؤ میں لکڑیاں ڈالنے لگتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ سونے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ کہانیاں سننے سنانے کے لیے

حالات سازگار نہیں ہیں۔ وہ جنگِ آزادی کا ہیرو رہ چکا تھا۔ اس نے انگریزوں پر کئی گولیاں برسائی تھیں۔ ان سے ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ مگر آج وہ ایک ایسے موڑ پر آکر رک گیا تھا جہاں سے وہ نہ آگے جانے کی کوشش کرسکتا تھا۔ اور نہ پیچھے پلٹنے کی غلطی!

وہ برسوں سے الاؤ کے قریب بیٹھ کر لکڑیوں کو کوئلہ بنتے دیکھ رہا تھا۔ جلنے کی بو محسوس کر رہا تھا۔ اور کرفیو کے چیمبر میں پھنسے لوگوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا——— میدان میں ٹہلنے لگا——— آگ شاید اس کے اندر بہت زیادہ بھر گئی تھی۔ ٹہلتے ہوئے اسے وہ باہر نکالنا چاہتا تھا۔ اس نے لکڑیاں آگ کی نذر کیں۔ بندوق کے ہتھے کو اپنی ہتھیلی تلے دبایا اور ٹرائیگر پر اپنی انگلی رکھی——— اور نشانہ باندھا۔

اب شکار اس کے لیے یا ان لوگوں کے لیے ضروری ہوگیا تھا۔ اس نے بندوق کی نال کا رخ اس علاقے کی طرف کردیا جہاں سے نعروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہی آوازیں پچھلے پچاس برسوں سے اس کا تعاقب کررہی تھیں۔ وہ ان آوازوں کو' نعروں کو خاموش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس علاقے کی طرف نشانہ باندھا مگر فائر نہیں کیا——————— شاید اس نے نشانہ غلط باندھا تھا——————— پھر اس نے تالاب کے کنارے کھڑے ہوکر اس علاقے سے اپنی نظروں کو ہٹاکر پولس چوکی کی طرف کردیا——————؟

پولس چوکی کے بارے میں سوچتے ہی اس کے ذہن میں چرمی جوتوں کی آوازیں گونجنے لگیں اور وہ ساری کہانیاں جو اس نے ان لوگوں کو سنائی تھیں۔ اس کے دماغ میں کلبلانے لگیں۔

اس نے پولس چوکی کی طرف نشانہ تو باندھا مگر فائر نہیں کیا۔

"فائر اس نے کیوں نہیں کیا؟" ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھے نے بڑی پھرتی کے ساتھ رخ بدلا اور فائر کردیا——— الاؤ کے گرد بیٹھے لوگ اونگھ رہے تھے۔ ان میں ذرا سی جنبش پیدا ہوئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے ——— اپنے اطراف میں دیکھا ——— کیا ہوا۔ اور پھر وہ اونگھنے لگے۔ مگر ان سب کے درمیان سونے والے اس شخص کو بوڑھے نے

موت کی نیند سلادیا تھا۔

بوڑھے نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی بندوق سنبھالے ان سب کے درمیان آکر بیٹھ گیا۔ اب ان کے درمیان سونے والا ایک شخص گہری نیند سوچکا تھا۔ اس نے تمام لوگوں پر ایک سرسری نظر دوڑائی۔ سبھی لوگ اونگھ رہے تھے' سو رہے تھے——— اپنے ہتھیاروں اور اپنے آپ سے بے خبر———!

———مگر اب الاؤ بجھ چکا تھا———

———آگ برابر لگی ہوئی تھی———

———اور وہ بوڑھا شخص کسی گہری سوچ میں غرق ہوگیا تھا———

———یا وہ بھی اونگھنے لگا تھا کچھ ٹھیک سے پتہ نہیں———!!
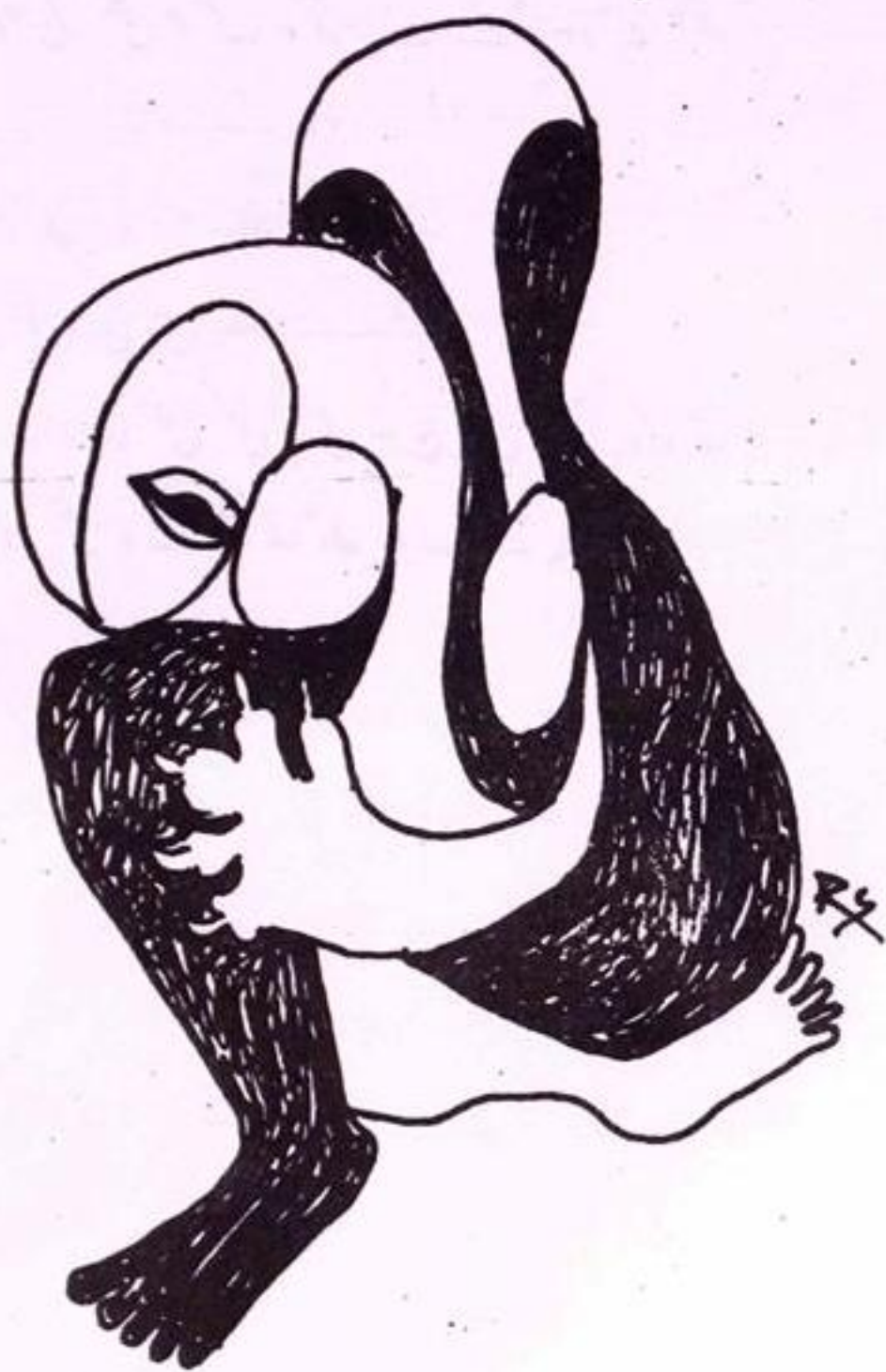
درندہ

ٹی وی بند کر کے میں بالکنی میں آگیا تھا۔ چینلوں کی بھرمار کے باوجود سیریل بوریت دور کرنے میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔ بالکنی میں ٹیبل اور کرسی ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ اکثر شام کو آفس سے گھر آنے کے بعد میں یہاں بیٹھ کر کالونی کے باہر کے مناظر سے محظوظ ہوتا تھا۔

ہماری عمارت کالونی کے آخری سرے پر تھی۔ احاطے کی دیوار سے چپکی ہوئی جھگی جھونپڑیاں دور تک بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے کالونی کے باہر گندگی کا ڈھیر اگ آیا ہے۔ دوسری طرف خالی میدان تھا۔ جس پر ہری ہری گھاس اگی ہوئی تھی۔ جہاں دن بھر کالونی اور جھونپڑپٹی کے لڑکے کرکٹ کھیلتے تھے۔ میدان سے ذرا ہٹ کر ریلوے لائن گزرتی تھیں۔ لوکل ٹرینیں اور دور دراز علاقوں کی طرف جانے والی گاڑیاں جب پٹریوں پر دوڑتی تو عجیب قسم کا شور پیدا ہوتا جو کانوں کو بھلا لگتا۔ میں پٹریوں اور گاڑیوں کو غور سے دیکھنے لگتا اور ایک لمحہ کے لیے اپنے آپ کو ٹرین میں بیٹھا محسوس

کر کے دور سفر پر نکل پڑتا۔

بیوی نے چائے کی پیالی تھما دی۔ چائے کی چسکیوں کے ساتھ میں جھگی جھونپڑیوں کو دیکھنے لگا۔ تنگ و تاریک گلیاں، ٹاٹ کے پردے، پلاسٹک کی چھتیں، گندگی کے ڈھیر، دروازوں پر بیٹھی عورتیں، بھاگتے دوڑتے ننگے بچے، شور و غل، لڑائی جھگڑے اور پتہ نہیں کیا کیا؟ میری نظریں دھیرے دھیرے شکنتلا کے جھونپڑے پر جاکر رک گئیں۔

شکنتلا۔ - - - ہاں وہی شکنتلا جو کام کرنے والی کی حیثیت سے جانی جاتی ہے اور ہمارے گھر کا اہم حصّہ ہے۔ جو ہماری ضرورت بن گئی ہے۔ شکنتلا کے متعلق سوچتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اشوک گائے تونڈے کا مرجھایا ہوا چہرہ آگیا۔ ایک شرابی بے روزگار اور زمانے کا ٹھکرایا ہوا آدمی جو طویل مدت سے شراب کو امرت سمجھ کر پی رہا تھا اور اپنی پتنی پر ظلم کرتا تھا۔

کافی دیر تک میں بیٹھا رہا۔ اندھیرا اتر آیا تھا۔ جھوپڑپٹی میں ملگجی روشنی نظر آرہی تھی۔ چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ شکنتلا اور گائے تونڈے کے درمیان تو تو میں میں کی آواز آرہی تھی۔ جواریوں، شرابیوں اور گرد پینے والوں کے آپسی جھگڑے اور دور کہیں لاوڈ اسپیکر پر اذان کی آواز آرہی تھی۔ ابھی میں ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک بیوی کی آواز آئی، "آئیے کھانا کھالیجئے۔ میں چپ چاپ ڈائننگ ہال میں چلا گیا، کھانے سے فارغ ہوکر ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ پھر بیوی شکنتلا کے بارے میں بتانے لگی۔

"اس کی چھوٹی لڑکی"

"کیا ہوا اسے"

"اپنے کمپاؤنڈ میں کھیل رہی تھی کہ کرکٹ کے بال سے زخمی ہوگئی۔ میں اسے اسپتال لے گئی اور مرہم پٹی کروالائی۔ بے بی نے الگ پریشان کیا۔"

باتوں باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا اور میرے پسندیدہ سیریل کا وقت ہوگیا اور ہم ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ سیریل ختم ہونے کے بعد کب مجھے نیند نے آگھیرا، کچھ پتہ ہی نہیں

چلا۔

صبح جب میں آفس جانے کے لیے تیار ہوا تو میں نے دیکھا کہ شکنتلا برتن دھو رہی تھی وہ گلابی رنگ کی ساڑی پہنے ہوئی تھی' ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے بیوی ہی ہو۔ یہ ساڑی بیوی نے ہی اسے دی تھی۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ جھاڑو لگانے لگی تب اس نے ساڑی کا پلو کمر کے اندر ٹھونس لیا تھا۔ وہ سیکسی لگ رہی تھی۔ میں نے نظریں ہٹالیں اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''شکنتلا کیسی ہو؟ کل رات تمہارے پتی کی آواز نہیں آئی' کیا اس نے شراب نہیں پی تھی؟''

''ساب! دارو تو وہ روز ہی پیتا ہے اور مجھے مارتا بھی ہے۔ کل بھی اس نے مجھے خوب مارا مگر شور بالکل نہیں کیا' آپ اسے سمجھائیے نا۔ ---- ساب وہ آپ کو بہت مانتا ہے اور آپ جیسا بولتے ہیں ویسا ہی کرتا ہے۔ آپ سے تو ڈرتا بھی ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے' اسے میرے پاس بھیج دینا' اسے سمجھاؤں گا۔'' میں جواباً کہا۔ پھر میں آفس کے لیے نکل پڑا۔ آفس پہنچ کر میں فائلوں میں گم ہوگیا۔

باس' لڑکیاں' فائلیں اور دیگر ملازمین۔

مگر ان سب کے درمیان مجھے شکنتلا کا چہرہ بھی دکھائی دے جاتا۔ فرش صاف کرتی' گلابی رنگ کی ساڑی پہنے شکنتلا' لیکن فوراً اس خیال کو اپنے دماغ سے جھٹک دیتا۔ وہ غریب ہے اور دکھی بھی۔ اس نے تو صرف اپنے پتی کے لیے کوئی چھوٹا موٹا کام تلاش کرنے کو کہا تھا کیونکہ اگر وہ اسی طرح کچھ دن بے روزگار رہا تو شکنتلا کو بھی بیچ کر شراب پی جائے گا۔ اشوک گائے تونڈے کے بارے میں میں خوب جانتا تھا۔ سائن اسپتال میں وارڈ بوائے ہوا کرتا تھا۔ ڈیوٹی پر بھی شراب کے نشے میں دھت ہوتا۔ اور لوگوں سے رشوت طلب کرتا تھا۔ اس لیے ایک دن اسے برطرف کردیا گیا۔ تب سے وہ شراب میں ڈوب گیا۔

لنچ ٹائم میں سبھی ساتھی ایک ساتھ ٹیبل پر کھانے کے لیے بیٹھے تو حسبِ عادت کھاتے

کھاتے ایک دوسرے کو چھیڑنے لگے' کوئی اپنے گھر کا ذکر کرنے لگا تو کوئی اپنے پڑوسی کا' کوئی اپنی بیوی کی تعریف کے پل باندھتا اور کچھ اپنی کام والیوں کا رونا رونے لگے۔

کام والیوں کے بڑے بھاؤ ہیں۔ بڑی کمینی ہوتی ہیں۔ لیکن اس بارے میں میں خوش قسمت تھا کہ میرے گھر میں شکنتلا جیسی شریف اور ایماندار کام والی تھی۔ شکنتلا ہمارے بچوں اور گھر کا جس طرح خیال رکھتی ہے اتنا شاید کوئی رشتہ دار بھی نہیں رکھے گا۔ کاش ان لوگوں کو بھی ایسی ہی کام والی مل جائے۔

شام کو جب آفس سے گھر لوٹا تو دروازہ شکنتلا نے ہی کھولا تھا۔ بیوی بیوی کچن میں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا

''تم اب تک گئی نہیں۔''

''نہیں ساب! میم ساب نے منع کردیا تھا۔ آپ کے لیے کچھ خاص بنایا ہے نا!''

''اچھا ذرا دیکھیں تو سہی کیا خاص ہے؟'' میں نے ٹیچی ٹیبل پر رکھی اور صوفے میں دھنس گیا۔ شکنتلا نے ٹیبل پر شامی کباب اور پکوڑے سے بھری پلیٹ لاکر رکھ دی۔ دوسری پلیٹ میں گاجر کا حلوہ اور دیگر چیزیں تھیں۔ میں جلدی جلدی کھانے لگا اور چٹخارے لینے لگا۔ کچھ دیر بعد شکنتلا خالی پلیٹ لے کر چلی گئی میں نے ٹی وی آن کردیا۔ اب تو سیریلوں میں بھی کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ آفس کے اور گھر کے آس پاس مجھے تو کئی کہانیاں دکھائی دیتیں مگر یہ ٹی وی پر پہنچ نہیں پاتی۔ شکنتلا اور گائے تونڈے کی زندگی پر بھی تو ایک اچھا خاصہ سیریل بن سکتا ہے۔ گائے تونڈے ایک ایسا انوکھا کردار ہے۔ جس کے پاس کوئی طاقت نہیں پھر بھی وہ ظلم کرتا ہے۔ بیوی گائے تونڈے کو درندہ سمجھتی ہے۔ اس سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اس کے دل میں کبھی گائے تونڈے کے لیے ہمدردی و خلوص پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ شکنتلا پر اس قدر ظلم کرتا تھا کہ کوئی اور عورت ہوتی تو کب کا گھر چھوڑ کر بھاگ جاتی۔ مگر یہ تو واقعی شکنتلا تھی جو ظلم و ستم کو اپنے پتی کا پیار سمجھتی تھی۔ اور اسی کے لیے جیتی تھی اسی کے لیے مرتی تھی۔ وہ کر بھی کیا کر سکتی تھی۔ اس کی دو چھوٹی بیٹیاں

تھیں۔ جن کی پرورش تو اسے ہی کرنی تھی۔ گانٹے تونڈے سے تو کوئی امید نہیں تھی۔ اسے شراب نے ایک دم ناکارہ اور درندہ بنادیا تھا۔ وہ تو صرف نشے میں اسے کسی کتے کی طرح چاٹتا اور بھنبھوڑتا۔ اپنا سارا فرسٹریشن اور غصہ اس پر اتارتا اور تھک کر سوجاتا' ایسا شخص کیا اپنی بیٹیوں کی دیکھ بھال اور پرورش کرسکے گا۔ شکنتلا مجبور تھی یا شاید اسے درندگی سے پیار ہوگیا تھا۔ اسی لیے وہ گانٹے تونڈے کے ساتھ رہ رہی تھی۔

میں اکثر رات میں بالکنی میں بیٹھ کر ان پتی پتنی کا لڑائی جھگڑا دیکھتا رہتا۔ مجھے تو اس گانٹے تونڈے سے گھن آنے لگی تھی۔ پھر بھی میں نے اسے نوکری دلوانے کی بہت کوشش کی مگر وہ جیسے زندگی سے مایوس اور بے زار ہوگیا تھا۔ بے اطمینانی کا شکار تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا مگر اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔

رات آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ میں اضطراب کے عالم میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ بیوی گہری نیند سورہی تھی' میں بالکنی میں آکر بیٹھ گیا' سگریٹ سلگائی اور دھواں ہوا میں اچھال دیا۔ میرے دماغ کے اسکرین پر دوڑتے منظر اچانک رک گئے جب میری نظریں ریل کے پٹریوں' کراسنگ اور اندھیرے میں ڈوبی عمارتوں سے ہوتی ہوئی شکنتلا کے جھونپڑے پر جاکر رک گئیں۔ باہر کھٹیا پر لیٹی شکنتلا کے ساتھ گانٹے تونڈے زبردستی کررہا تھا اور پھر بڑی بے حیائی کے ساتھ وہ ایک دوسرے میں کھوگئے۔ ان کی بے ہنگم سانسوں نے سناٹوں کو جگا دیا تھا۔ میرے منہ سے یہ فقرہ نکل پڑا۔

گندے لوگ' ذلیل' بے ہودہ'

میں سوچنے لگا کہ یہ شکنتلا کیسی عورت ہے جو مار کھاکر بھی پتی سے چپکی رہتی ہے مجھے بڑا افسوس ہوا اور دکھ بھی' لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے انوکھی لذت کا احساس بھی ہوا میرے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ سیکس جارحانہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ مجھے اب پتہ چلا تھا۔

صبح جب میں تیار ہوکر ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو میں نے دیکھا کہ شکنتلا فرش دھو رہی تھی۔ اس کے دونوں بازو زخمی تھے اور چہرے پر خراشیں۔ اس کے یہ زخم رات میں اس پر ظلم کی چغلی کھا رہے تھے۔ بیوی کہنے لگی۔ رات گائے تونڈے نے شاید اسے خوب پیٹا، جبھی تو یہ زخم آئے ہیں۔ مگر جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے ایک دم مطمئن لگی۔ اور خوش بھی۔

میری بیوی بک بک کئے جارہی تھی۔ کہ ایسے درندے کو چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔ مگر ان باتوں سے دور شکنتلا سوچ کے جنگل میں کھوئی تھی۔

میں آفس کے لیے نکل گیا۔

بیوی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ آج لیٹ آؤں گا۔ کیونکہ آفس میں گائیکواڑ صاحب کے پرموشن کے سلسلے میں ایک پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پارٹی رات دیر تک چلے گی۔ لوٹنے میں دیر ہوجائے گی۔ بیوی اس بڑے فلیٹ میں اکیلے ڈرتی تھی اس لیے اس نے شکنتلا کو روک لیا تھا۔

پارٹی بہت دیر میں ختم ہوئی۔ جب میں گھر پہنچا تو بیوی سوچکی تھی۔ کئی بار بیل بجانے کے بعد وہ جاگی اور دروازہ کھولا۔

"آگئے آپ۔"

"شکنتلا کہیں دکھائی نہیں دے رہی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"چلی گئی۔ اس کا پتی آیا تھا۔ نشے میں تھا۔ اس لیے میں نے اسے روکا نہیں۔ اسے جانے دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اب تک خوفزدہ تھی۔ اسی لیے دروازہ کھولنے میں بھی دیر کی۔ عجیب و غریب خیالات آرہے تھے۔"

بیوی نے کہا۔

"بے بی کہاں ہے؟"

''سو گئی''۔

''آج پھر آپ نے توبہ کرنے کے بعد دوبارہ۔۔۔۔۔؟''

''نہیں بس تھوڑی سے چکھی ہے۔ دوستوں کے اصرار پر۔''

وہ نندا سی تھی۔ بستر پر جاکر لیٹ گئی میں اسے اسی حالت میں۔ وہ منع کرتی رہی۔ ''مجھ سے دور ہٹ گئی۔ آپ نے شراب پی رکھی ہے۔ قریب مت آئیے۔ مگر مجھ پر تو جنون سوار ہوچکا تھا۔ شراب نے میرے اندر ہلچل پیدا کردی تھی۔ وہ بار بار انکار کرتی رہی۔ آخرکار دوچار تھپڑ رسید کرنے کے بعد میں نے اس پر قابو پالیا۔ میرے زبردستی کرنے سے اس کے اندر کتنی ٹوٹ پھوٹ ہوئی یہ شاید وہ ہی جانتی ہے۔

صبح جب جاگا تو سورج کی کرنیں روشن دان سے گزر کر میرے چہرے کو نہلا رہی تھیں۔ میں اٹھ بیٹھا۔ بیڈ روم سے نکل کر ہال میں آگیا۔ بیوی اور بے بی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتہ کررہے تھے۔ بے بی نے جب مجھے دیکھا تو اپنی آنکھیں بند کرلیں اور وہ اپنے اندر بہت زور سے چیخی تھی۔ اس کی آواز میں سن نہیں پایا تھا۔ صرف محسوس کرسکا تھا۔ شکنتلا قریب بیٹھ کر سبزی ترکاری کاٹ رہی تھی۔ بیوی اس سے پراسرار انداز میں سرگوشی کررہی تھی۔ میں نے ان کے قریب جاکر سننے کی کوشش کی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی' کیونکہ بیوی شکنتلا سے کہہ رہی تھی۔ شکنتلا! تمہارا گائے تونڈے درندہ نہیں ہے۔۔۔'' میں اس کے آگے کچھ نہ سن سکا۔

البتہ بیوی کی پیشانی پر کھرونچ کا تازہ نشان ضرور دیکھ رہا تھا۔

●●

اندر کا آدمی

میں سگریٹ سلگاکر کرسی پر دراز ہوگیا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں بھی سارے مناظر میری آنکھوں کے سامنے دوڑنے لگے۔ کمرے میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا اور اس دھواں زدہ ماحول سے میں باہر نکلنا چاہتا تھا۔

ان دنوں میں چپ چپ اور خاموش سا رہنے لگا تھا۔ حالات نے مجھے سنجیدگی اور متانت کے حوالے کردیا تھا۔ ساری آوارگیاں ختم ہوگئی تھیں۔ راتوں کا جاگنا' دوستوں کے ساتھ سڑکوں پر بھٹکنا' لڑائی جھگڑے' بحث و مباحثے' چھیڑ چھاڑ' سب کچھ جیسے خواب ہوکر رہ گیا تھا۔ ازدواجی زندگی کے جھمیلوں میں کچھ اس طرح الجھا کہ پھر دوستوں کی طرف مڑکر نہ دیکھا کس حال میں وہ ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ شاید شادی کے بعد ہی میں نے زندگی کا صحیح مفہوم سمجھا تھا۔

گھریلو ذمہ داریوں نے مجھے بدل کر رکھ دیا تھا۔ دھیرے دھیرے میرے اندر کا منہ زور آدمی شریف اور ذمہ دار شخص بن گیا تھا۔ اور اس کے پیچھے میری بیوی کا ہاتھ تھا۔ اس نے مجھے

ذمہ داریوں کا احساس دلایا تھا۔ اور ہم دونوں نے زندگی کا ایک نیا سفر شروع کیا جو معمولی نوک جھونک، چھوٹے موٹے جھگڑوں کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

بیوی جب آفس سے گھر لوٹتی تو کبھی کبھی غصے سے آگ بگولہ ہوتی حالات کو بھی کوستی اور اپنے آپ کو بھی۔ ہوتا یہ تھا کہ گول بلڈنگ کے نکڑ سے جب وہ گزرتی تو آوارہ گرد لڑکے اسے چھیڑتے اور وہ آپے سے باہر ہوجاتی۔ گھر پر آکر وہ پھٹ پڑتی۔

وہ کہتی ''اب یہاں سے بھی کوچ کرنا چاہیے۔ یہ شریفوں کا علاقہ نہیں رہا۔ یہ لوگ کام تو کچھ کرتے نہیں بس نکڑ پر بیٹھ کر آتی جاتی لڑکیوں پر فقرے کستے ہیں، سیٹیاں بجاتے ہیں، فلمی گانے گنگناتے ہیں۔ دھکا مار کر گزر جاتے ہیں، لڑائی جھگڑے، شور شرابہ، ہنگامہ بس یہی پہچان ہے ان لوگوں کی؟ آپ ان غنڈوں کو کچھ بولتے کیوں نہیں؟ انھیں منع کیجیے یا روکیے۔ پولس میں رپورٹ لکھوائیے۔''

میں اسے سمجھاتا کہ وہ راستہ بدل دے یا رکشا سے آیا جایا کرے۔ ان آوارہ گرد لڑکوں کی طرف کوئی توجہ نہ دے۔ مگر وہ اپنی بات پر بضد رہی میں کوشش کے باوجود ان لڑکوں سے بات نہ کرپاتا۔

کبھی کبھی کوئی کہتا جاؤ ان سب لونڈوں کو گولی مار دو جنھوں نے تمہاری بیوی پر بری نظر ڈالی۔ جاؤ۔ - - ؟''

لیکن پھر میرے اندر سے آواز آتی - - - نہیں یہ وقت بندوق اٹھانے کا نہیں اور میں سرد پڑجاتا۔ میں اندر کے آدمی کی بہت ساری باتوں پر عمل کرتا ہوں۔

مجھے خوب علم تھا کہ یہ سب چھیڑ چھاڑ خانی اتی دادا کے اشاروں پر ہورہی ہوگی۔ شاید چندے کا معاملہ رہا ہو۔ یا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔ بہرحال میں نکڑ کے آوارہ گرد لڑکوں سے تو تو میں میں یا کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غنڈوں سے ٹکرانا گویا مصیبت کو گھر بلانا تھا۔

ادھر بیوی کسی گھائل شیرنی کی طرح مجھ پر لفظی حملے کرتی رہتی اور میں تلملاتا رہتا۔ بے چینی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگتا۔ کبھی بالکنی میں آکر بیٹھ جاتا، کبھی ڈرائنگ روم میں

تو کبھی بیڈروم میں، ہر جگہ بیوی کی زبان سے نکلے ہوئے کڑوے کسیلے لفظ میرا تعاقب کرتے اور بار بار میری سماعت سے ٹکراتے

''۔۔۔ بزدل ۔۔۔ ڈرپوک۔۔۔''

جب میں نیند کی آغوش میں چلاجاتا تو غنڈوں کے بے ہودہ فقرے اور بیوی کے نوکیلے جملے کانٹوں کی طرح چبھنے لگتے اور میں ہڑبڑاکر اٹھ بیٹھتا جیسے بستر کانٹوں سے بھرا ہوا ہو۔ یا پھر کہیں اندر بہت سی بجلی چمکی ہو۔ پھر میں بے چینی کے عالم میں کمرے کا جائزہ لینے لگتا اور سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لیتا۔

نائٹ بلب کی سرخ روشنی جیسے کسی خطرے کا سگنل دے رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیوی دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی اور میری چھوٹی بیٹی ۔۔۔ وہ شاید چاند میں پریاں دیکھ رہی تھی۔ کمرے کے اندر اور باہر اندھیرا ہی اندھیرا اور دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا۔ بیوی پر نظر پڑتے ہی میرے دماغ کے اسکرین پر کل شام کا واقعہ کسی فلم کی طرح چلنے لگا۔

الّی دادا، اس کے چیلے اور چندہ!

الّی دادا علاقے کا سب سے بد نام اور خطرناک غنڈہ تھا۔ جو اپنے چیلوں کے ساتھ جب چاہتا کالونی میں آدھمکتا اور چندہ طلب کرتا تھا۔ خاص طور پر تہواروں کے موقع پر۔ اس بار یہ لوگ شب برات کا چندہ لینے آئے تھے۔ شب برات کو بڑی رات بھی کہا جاتا ہے۔ سبھی مسلمان رات بھر خدا سے دعائیں کرتے ہیں اور عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ عبادت گاہوں کو روشنی سے خوب سجایا جاتا ہے۔ جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں۔ غنڈے گھر گھر جاکر چندہ وصول کرتے۔ یہ لوگ محرم میں کھچڑے اور غوث الاعظم کی نیاز کا اہتمام بھی اسی انداز سے کرتے اور کالونی کے مکینوں کو عام دعوت دی جاتی۔ اس مذہبی کام کے لیے چندہ بھی دل کھول کر دیا جاتا۔

میں نے بھی خاموشی کے ساتھ پچاس کا نوٹ الی دادا کی طرف بڑھا دیا تھا۔ اور وہ مسکرا

کر آگے بڑھ گیا تھا۔

میں جس عمارت میں رہتا تھا اس میں سیڑھیوں پر روشنی نہیں تھی۔ شام ہوتے ہی یہ عمارت اندھیرے میں ڈوب جاتی۔ کئی بار کوشش کی گئی کہ ہر فلور پر ٹیوب لائٹ لگائی جائے مگر یہاں کے رہنے والے تیار نہیں ہوئے۔

کیوں کہ اس کے لیے بھی انھیں چندہ کرنا پڑتا۔ جو مشکل کام تھا۔ آلی دادا کو لوگ ڈر کر چندہ دیتے تھے۔ الی دادا ایک بہت بڑی مصیبت کا نام تھا اور اندھیرا ان کے لیے کوئی مصیبت لے کر نہیں آتا تھا۔

اس محلے میں شفٹ ہونے سے قبل میں شیواجی نگر میں رہتا تھا جو ہندوؤں کی بستی تھی۔ وہاں بھی اسی طرح کے حالات تھے۔ گنیش وسرجن، نوراتری، شیو جینتی اور دیگر تہواروں پر چندہ وصول کیا جاتا تھا۔

مسلمان وہاں کچھ دبے سے رہتے تھے لیکن دلتوں اور ہندوؤں میں اکثر تصادم ہو جاتا۔ کیونکہ دلت بھی امبیڈکر جینتی پر خوب چندہ جمع کرتے تھے۔

اب ہم جہاں رہتے ہیں وہ مسلمانوں کا محلہ کہلاتا ہے لیکن ماحول میں کیا فرق ہے؟ وہی نکو، غنڈے، آوارہ گرد لڑکے، اور ان کا خوف؟ اب تو مجھے سب کے چہرے ایک ہی جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ صرف ان کے نام مختلف تھے وہاں کا چھوٹا رگھو یہاں کا چھوٹا جمیل بن گیا تھا۔

میں سماج کے غنڈہ عناصر سے کبھی نہیں الجھا ۔ نہ کبھی ان سے مورچہ لیا۔ زندگی کے مورچے پر خود اپنے آپ سے لڑتا رہا ہوں۔ پھر اکیلا میں کیا کرسکتا تھا؟ شرافت کا دامن میرے ہاتھ میں تھا اور شاید اسے میں چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ آفس میں بھی میں کبھی کسی سے نہیں ٹکرایا۔ حالانکہ مشرا جی اور شندے مجھے ہمیشہ چھیڑتے رہتے۔ اشتعال انگیز باتیں کرتے لیکن میں طرح دے جاتا۔ دراصل میں ٹینشن لے کر جینا نہیں چاہتا۔ آفس میں ان بدباطن لوگوں سے مقابلہ اور آفس کے باہر غنڈوں سے سامنا۔

آخر ایک شریف آدمی کتنے مورچوں پر لڑتا رہے گا اور پھر بھی ڈرپوک کہلائے گا۔

یہ تو دنیا ہے یہاں ہر قسم کے لوگوں سے نبھانی پڑتی ہے۔ اسی لیے تو میں اِلّی دادا سے کوئی دشمنی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بیوی کو کون سمجھائے وہ تو ہر وقت لڑائی کے موڈ میں رہتی ہے۔ اِلّی دادا غنڈہ تو تھا ہی ایک سوشل ورکر بھی تھا۔ وہ محلے والوں اور کالونی کے مکینوں کے چھوٹے موٹے مسائل چٹکی بجاکر حل کردیتا تھا۔

محلے میں کبھی پانی کا مسئلہ سر اٹھاتا تو کبھی گٹر اور کچرا کنڈیوں کا، کبھی لائٹ کا، تو کبھی سڑکوں کو ٹوٹ پھوٹ کا۔ اِلّی دادا سرکاری ملازمین کو رشوت دے کر سارے مسائل حل کرادیتا تھا۔ سرکاری دفتروں میں اس کے گہرے مراسم تھے جس کا وہ خاطر خواہ فائدہ اٹھاتا تھا۔

اِلّی دادا کو دیا گیا پچاس کا وہ نوٹ میری بیوی ہضم نہیں کرپائی وہ مجھ پر برس پڑی "ایک معمولی غنڈے سے ڈر گئے۔ کبھی انکار کرنا بھی سیکھیے۔ ہندوؤں کے علاقے میں دب کر رہنا مصلحت کا تقاضا تھا مگر یہ علاقہ تو ہمارا اپنا ہے۔ کیا یہاں بھی یہ سب ہوگا؟ پچاس روپے کمانے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ یہ اچکے کیا جانیں۔ اب ذرا سا ہچکچائے، کمزور سے کمزور آدمی بھی آپ پر غالب آجائے گا۔ اور کیا ان بدمعاشوں نے تہوار منانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ یہ تو مذہب کے نام پر ہم سے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ آخر کب تک ہم ان کا شکار بنتے رہیں گے۔"

بیوی کی جلی کٹی باتیں سن کر میں سناٹے میں آگیا تھا۔

اسے تو چیخنے چلانے کی عادت تھی مگر آج اس نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل سچ تھا۔

آج سے نہیں برسوں سے یہ سب ہورہا تھا۔ راشٹر پتا گاندھی جی نے تو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور تشدد کو ختم کرنے کو کہا تھا۔ مگر ہم تو ظالم کی مدد کررہے تھے اسے طاقتور بنارہے تھے اور ہم کر بھی کیا سکتے تھے؟ اگر غنڈوں کے دباؤ میں نہ آئیں تو جینا دوبھر ہوجائے۔

ان کی بات نہ مانیں تو یہ لوگ آپ سے کچھ نہیں کہیں گے مگر پھر اچانک کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹیں گے، کمروں میں پتھر آئیں گے، کالونی کے باہر نکلتے ہی بس اسٹاف پر کوئی آپ کا گریباں پکڑلے گا، کوئی اچانک آپ کو دھکا مار کر گزر جائے گا۔ آپ بس میں سوار نہیں ہو پائیں گے کوئی آپ کو بہت پیچھے ڈھکیل دے گا۔ شام کو زخمی حالت میں گھر پہنچیں گے۔ آپ کے گھر میں گھس کر توڑ پھوڑ بھی کی جا سکتی ہے اور آپ تماشا دیکھتے رہیں گے۔

ہر راستے پر ایک نکڑ ہے اور ہر نکڑ پر ایک گول بلڈنگ، اور ہر گول بلڈنگ کے آس پاس ان کی ٹولیاں۔ گھر تبدیل کرنے کا مطلب ہے، نئی جگہ پر نئے غنڈوں سے سامنا۔ جہاں بھی جائیں گے ایسے ہی عناصر سے واسطہ پڑے گا۔ بہتری اسی میں ہے کہ چپ چاپ سہتے رہیں۔ پولس میں رپورٹ لکھوانا بے وقوفی تھی۔ غنڈے اور پولس دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔

نائٹ بلب کی سرخ روشنی میں میں کہیں دور نکل گیا تھا۔ بچپن کی سہانی یادوں کی طرف وہ بھی کیا دن تھے۔ فکروں اور پریشانیوں سے آزاد۔ میل جول، ہنسی مذاق، چھیڑچھاڑ، کھیل کود، روٹھنا منانا، بہت کچھ تھا ہمارے پاس، ان دنوں نہ کوئی بھید بھاؤ تھا نہ اونچ نیچ، نہ کوئی چھوٹا تھا نہ بڑا، نہ کوئی کالا تھا نہ گورا، نہ کوئی دلت تھا نہ برہمن اور نہ کوئی مسلمان تھا نہ ہندو۔ نہ غنڈے تھے اور نہ ان کا سماج۔ ہر طرف انسانیت کی مہک تھی جو دلوں کو زندہ اور دماغوں کو تر و تازہ رکھتی تھی۔

بچپن میں مجھے سانپ چھپکلی، گرگٹ اور کیڑے مکوڑے مارنے کا بڑا شوق تھا۔ کھیتوں کی طرف جاتا تو درختوں پر بیٹھے گرگٹ مار گراتا۔

میرا نشانہ ایک دم پکا تھا۔ اور گرگٹ مارنے پر ثواب بھی ملتا تھا۔

مگر برسوں بعد اب مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے فضول مار دھاڑ ٹھیک نہیں۔ بے قصوروں کو تکلیف پہنچانا بہت بڑا گناہ ہے۔

میری بیوی کاکروچ سے بہت ڈرتی ہے۔ مگر جب بھی وہ کاکروچ مارنے کو کہتی ہے میں کاکروچ پکڑ کر باہر چھوڑ دیتا ہوں۔ وہ خود بہت سی چیزوں سے ڈرتی ہے مگر ڈرپوک مجھے کہتی ہے۔

"دیکھو وہ پھر آئے گا۔ اب کی بار اسے ماردینا۔ موذی جانور اور کیڑے مکوڑوں کو مار دینا چاہیے۔"

مگر اسے کیا پتہ کہ میرے اندر تو کوئی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور مجھے اہنسا کا سبق پڑھا رہا تھا۔

میں کرسی سے اتر گیا۔ اور سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گیا۔ کاش میرا بچپن واپس آجائے یا میں تیس سال پیچھے کی طرف لوٹ جاؤں وہ آزادیاں مجھے پھر نصیب ہوں جو میرے ماضی کا حصّہ تھیں۔

نائٹ بلب کی روشنی نے میرے اندر اور زیادہ اندھیر کردیا تھا۔ میں نے ٹیوب لائٹ جلادی پھر بھی اندر کا اندھیرا کم نہیں ہوا۔ باہر ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بیوی بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ مگر چھوٹی بیٹی دوسرے بستر پر تھی۔ سگریٹ ختم ہونے کو تھی۔ نیند کا پرندہ آنکھوں کے صحرا میں پھڑپھڑانے لگا تھا۔ اور میرے اندر بے چینیوں کے سانپ رینگ رہے تھے۔ دل دھونکنی کی طرح دھڑک رہا تھا۔ میں بچپن کی یادوں کے سحر سے باہر نکلنا چاہتا تھا کہ اچانک میری نظر تکیے پر پڑی۔ ایک کھٹمل تکیے سے نکل کر بیوی کی گردن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے گول بلڈنگ کا نکڑ ابھرنے لگا اور وہاں موجود سب غنڈوں کے چہرے۔ اپّی دادا کا چہرہ اور زیادہ بڑا ہوگیا تھا۔ میرے اندر آگ سی لگ گئی تھی۔ اور بہت کچھ جل کر راکھ ہوگیا تھا۔

اسی وقت کوئی انجانا شخص میرے اندر سے بہت تیزی سے باہر نکلا اور کھٹمل کی طرف بڑھ گیا۔ اسے میری بیوی کی گردن تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور پیروں تلے روند دیا۔

چاروں طرف خاموشی گہری ہو گئی۔

ایک لمحے کے لیے مجھے بڑا سکون ملا۔ راحت کا احساس ہوا۔

پھر میں نے ایک لمبا کش کھینچ کر سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک دی۔ ٹیوب لائٹ بجھادی۔ نائٹ بلب جلا کر خود کو بیوی کے پہلو میں گرا دیا۔ پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بیوی سے کوسوں دور ہوں۔

اچانک میری نظر کرسی کی طرف چلی گئی۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ کرسی پر کوئی دوسرا شخص سگریٹ جلائے کسی گہری سوچ میں غرق بیٹھا دھواں فضا میں اچھال رہا تھا۔
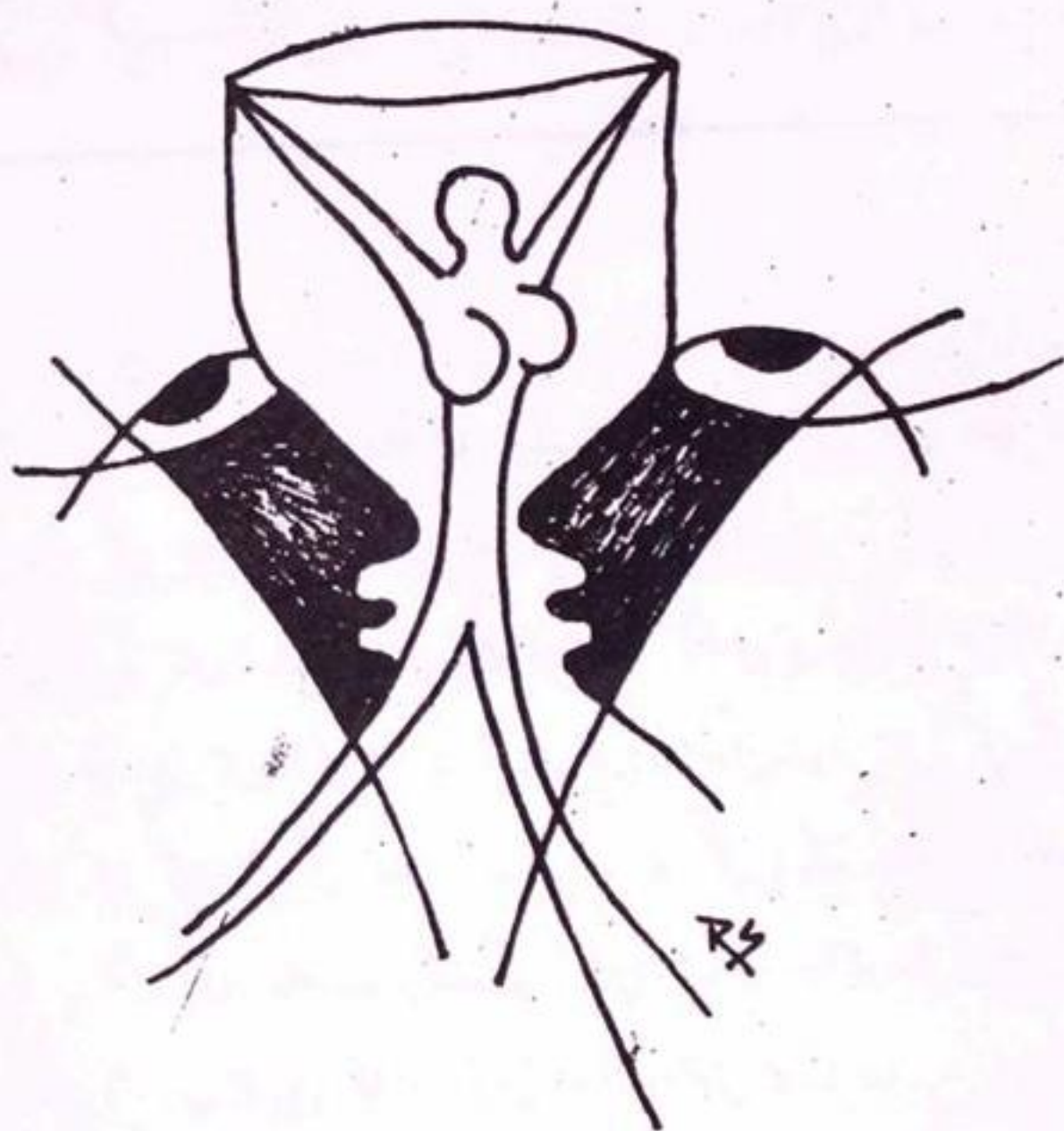
بیئر بار

گلاس بالکل میری طرح خالی ہوچکا تھا۔ ایک ہی گھونٹ میں میں نے ساری شراب اپنے اندر انڈیل دی تھی۔ پھر بھی میں خالی تھا' ایک دم خالی۔۔۔

ایک طویل سانس کھینچ کر میں نے بار میں بیٹھے فرسٹریٹیڈ لوگوں پر طائرانہ نظر ڈالی اور واپس اپنے خول میں آگیا تھا۔ بار میں لڑکی بڑے اطمینان اور پرسکون انداز میں بیٹھی تھی اور گلاس میں شراب انڈیل رہی تھی۔ اس کی ساری توجہ شراب پر تھی یا مجھ پر۔۔۔ اور میری بھی ساری توجہ کا مرکز یہ لڑکی تھی۔ سانولے رنگ کی یہ لڑکی ہڑپا اور موہنجوداڑو کی طرح اسے میں نے دریافت کیا تھا۔ نام اس کا روپا تھا اور تاریخ جغرافیہ دلتوں کا سا تھا۔۔۔ وہ اپنے ماتا پتا کا ایک ہی سہارا تھی اس کے پتا کو اپاہج بنا دیا گیا تھا تب سے اپنے کنبے کی کفالت کی ساری ذمہ داری اس کے ناتواں اور خوبصورت کندھوں پر آگئی تھی۔ بس ایسی ہی کہانیاں بار میں بکھری ہوئی لڑکیوں سے منسلک تھیں۔

جب میں ان لڑکیوں کے تعلق سے سوچنے لگتا ہوں اور سنجیدہ ہوجاتا ہوں تو مجھے دنیش جی بے حد یاد آجاتے ہیں۔ ان کی بیوہ اور کشمیر کی وادیوں کی طرح خوبصورت جوان لڑکیاں! کیا ہوگا ان کا؟ --- کہاں جائیں گی وہ؟ --- کہاں اور کس حال میں ہوں گی وہ؟

دنیش جی کو یاد کرنا، ان کی موت پر کبھی کبھی بار میں بیٹھ کر آنسو بہانا میری کمزوری بن گئی تھی۔ اکثر میرے اندر کا میں مجھ پر ہنستا، کچوکے لگاتا، اور مجھ کو مجبور کرتا، شرمندہ کرتا۔ -- میں اپنے آپ سے اور اس سوچ سے بھاگنے لگتا ہوں دور، بہت دور؟ تب مجھے خود سے گھن محسوس ہونے لگتی ہے اور اس کش مکش میں دنیش جی مجھے یاد آجاتے ہیں، میں آنسو بہاتا ہوں اور تھوڑی دیر کے لیے اس دنیا وہ مافیہا سے بے خبر اپنے اندر جھانک لیتا ہوں۔ -- قصائی واڑے کے اس معمولی اور کیچڑ زدہ آدمی پر رونا، آنسو بہانا ہی میرے زندہ ہونے کا ثبوت ہے۔ میرے اندر کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گوشہ ایسا ہے جہاں میں زندہ ہوں اور دنیش جی بھی وہیں ہیں۔

روپا نے گلاس بھر دیا تھا اور وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے یہ لڑکی شراب میں پڑی برف کی طرح دھیرے دھیرے پگھل رہی ہے اور اسے پگھلتا ہوا دیکھ کر میرے اندر جذبات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور میں آہستہ آہستہ اس کے خد و خال میں نظریں گڑائے کھوتا جارہا ہوں۔ مگر اس معمولی ڈائریکٹر کا کبھی نہ بھولنے والا کردار مجھے صحیح راستہ دکھاتا ہے اور میں واپس اپنے آپ میں لوٹ آتا ہوں کہ دنیش جی نے مجھے اور مجھ جیسے سیکڑوں نوجوانوں کو زندگی کا ایک نصب العین دیا اس نصب العین کو لے کر چلنا سکھایا۔ اس کرپٹ زندگی اور سڑے ہوئے سسٹم سے نفرت سکھائی۔

ستیش بھٹناگر چپ ہے۔ ایک دم چپ، وہ خاموشی کے ساتھ چسکیاں لے کر شراب پینے کا عادی ہے۔ میرے آفس میں کلرک ہے۔ اور عام کلرکوں کی زندگی کی طرح اس کی بھی زندگی ہے۔ وہ اپنے پاس ایک اپاہج اور بدصورت بہن رکھتا ہے اور اس کی شادی کے لیے فکر مند ہے۔ فکر اسے دیمک کی طرح کھائے جارہی ہے۔ پریشانیاں، تفکرات اور ذہنی تناؤ

نے اسے فرسٹریٹڈ کردیا ہے۔

ہم دونوں فرسٹریشن کے شکار اکثر و بیشتر آفس سے نکلنے کے بعد شردھابار میں بیٹھ کر اپنے موڈ کو فریش کرتے ہیں۔ گھنٹوں بیٹھے بحث کرتے، مسائل کا حل ڈھونڈتے، حکومت کو گالیاں بکتے اور اپنوں کی خود غرضیوں پر آنسو بہاتے اور غیروں کی وفاداریوں پر خوش ہوتے اور بار میں سروس کرنے والی لڑکیوں کی خوب صورتی میں گم ہوجاتے۔

میں ستیش کی بہن کے بارے میں سوچتے سوچتے بہت دور نکل جاتا ہوں۔ مجھے سبھی لڑکیاں اپاہج نظر آتی ہیں۔ وہ چاہے میری بہن ہو یا بار میں شراب کی بوتلوں کی طرح سجی ہوئی یہ لڑکیاں! ستیش بھٹناگر نے میری سوچوں کے سلسلے کو منقطع کردیا اور میں واپس بار میں آگیا۔ جہاں شراب تھی، لڑکیاں تھیں اور بھٹناگر تھا۔

''ہیو یار --- کہاں کھو گئے --''

''میں نہیں --- بس یوں ہی ذرا دور نکل گیا تھا۔ قصائی واڑہ، سنسار ہوٹل، نشیمن سے لے کر ہلاؤ پل اور پہاڑی تک ہو آیا ہوں۔''

یہ علاقے دنیش جی کی زندگی کے حصے ہیں اور دنیش جی میری زندگی کی ایک گم شدہ کڑی! --- میں انھیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ آج بھی وہ کہیں نہ کہیں نظر ضرور آتے ہیں۔ سنسار ہوٹل کے پاس، پرتھوی تھیٹر کے قریب، شردھابار کے اندر۔

اب وہ اس دنیا میں کہاں؟ وہ تو دیو مالائی کہانیوں کی طرح اب ہمارے اندر رہ گئے ہیں۔ میں کبھی اس بار میں آتا ہوں تو مجھے دنیش جی بے حد یاد آجاتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شردھابار میں کسی ٹیبل پر کہیں نہ کہیں بیٹھے ہوں گے۔ یہیں کہیں میرے قریب، آس پاس!

''ہیو یار ---'' ستیش بھٹناگر میری بات کاٹتے ہوئے کہتا ہے ''کہیں بھی کچھ نہیں ہوتا ہے --- نہ کوئی مرتا ہے اور نہ کوئی جیتا ہے۔ بس سب کچھ جو ہورہا ہے وہ دراصل آنکھوں کا دھوکہ ہے، فریب ہے۔ اس لیے چپ چاپ پیتے جاؤ۔ بغل میں لڑکی ہو جوان ---

خوب صورت اور ہاتھ میں جام ہو تو آدمی اپنے پتا کی موت اور جوان بہن کی چتا بھی بھول جاتا ہے اور اتفاق سے ہمارے پاس دونوں چیزیں ہیں پھر تم یہ کیوں سوچ رہے ہو۔''

''یوں ہی۔ ۔ ۔'' جتیس بھٹناگر کی بات پر میں شراب کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیتا ہوں اور ایک ہی گھونٹ میں پورا گلاس خالی کر دیتا ہوں۔ وہ اکثر میرے متعلق کہا کرتا ہے۔

''یار تم شراب' پانی کی طرح پیتے ہو' گھونٹ گھونٹ اور چسکیاں لے کر نہیں۔ یہ شراب کی توہین ہے۔ مزا تو جب ہے کہ آدمی شراب اور شباب دونوں کو دھیرے دھیرے چسکیوں میں پیے۔''

پتہ نہیں یہ عادت مجھ میں کب در آئی کہ میں ہر کام بڑی عجلت سے انجام دیتا ہوں۔ کھانا ہو' پینا ہو' راستہ چلنا ہو' لڑکیوں سے دوستی کرنا ہو' یا پھر تعلقات منقطع کرنا ہو۔ ۔ ۔ چاہے کوئی کام ہو۔ ۔ ۔ جلد بازی میری کمزوری ہے یا فطرت!

مگر شراب چسکیاں لے کر پینا اور لڑکیوں کے جسم پر چیونٹی کی طرح رینگنا میں نے ان سے ہی سیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے کہ۔

'زندگی میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ سارے تعلقات اور رشتے بناوٹی اور ڈھکوسلہ ہیں۔

اور دوستوں کے بارے میں ان کا ارشاد۔ ۔ ۔ کہ

اس قصائی واڑے کے تمھارے تمام دوست بہت بڑے اداکار ہیں۔ ایک ایسے اسٹیج پر اداکاری کر رہے ہیں۔ جس کے تماشائی بھی ہم ہی ہیں۔

بھٹناگر ہنسنے لگتا ہے: ''یار' تمھیں بہت چڑھ گئی ہے۔ یہ کیا اناپ شناپ بک رہے ہے۔ آخر کون تھا یہ دنیش؟ جس کے غم میں تم اس بار میں بیٹھ کر آنسو بہاتے رہتے ہو۔ میں نے اکثر سوچا کہ تم سے دریافت کروں۔ ۔ ۔ مگر تم سنانے سے پہلے ہی مدہوش ہو جاتے ہو۔ ۔ ۔ آج تو بتادو کون تھا یہ دنیش؟''

''ایک عام اور معمولی آدمی' زندگی کی الجھنوں اور پیچیدگیوں سے مقابلہ کرنے والا سپاہی' سلاٹر ہاؤس میں برسوں سے رہتے ہوئے بھی ان میں ظلم و بربریت اور انسانی اقدار کو

روندنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوسکا۔ وہ ایک معمولی اور ہر دل عزیز ڈائریکٹر ہی رہے' قصائی نہیں بن سکے۔ اسٹیج ان کی زندگی کا نصب العین ایک دیرینہ خواب تھا۔ ڈرامہ کرنا' ڈرامہ جینا ان کا مقصد تھا' پرتھوی تھیٹر کبھی شیواجی مندر' تو کبھی رویندر ناٹیہ مندر پر ڈرامے کرنا اور ڈرامے دیکھنا ان کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا صرف سیر و تفریح ہی ان کی عادت نہیں تھی۔ بلکہ مظلوموں اور پسے ہوئے لوگوں کو ان کا حق دلانا' ان کے لیے لڑنا بھی ان کی زندگی کا اصول تھا۔ انھوں نے نئے نئے اداکاروں کو موقع فراہم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا اور وہ ہمیشہ نئے اداکاروں کو لے کر ڈرامہ کرتے تھے۔''

''بس اس دن پہلی بار میں نے اس اداکار' اس ڈائریکٹر کو اپنے اندر سے باہر دیکھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ اور چہرے پر پسینے کی بوندیں اگ آئی تھیں۔ آنکھوں میں خون اور مٹھیاں فضا میں لہرا رہی تھیں۔ -- ایسا لگتا تھا جیسے برسوں سے اس آدمی کے اندر ایک لاوا پک رہا تھا اور اب شاید اس کے باہر نکلنے کا موقع آگیا تھا۔ -- اور پیارے' اسی دن مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ دنیش جی جیسا معمولی آدمی جب انصاف اور مساوات کے لیے' اپنے حقوق کے لیے احتجاج کرتا ہے تو وہ عام آدمی نہیں رہتا۔ بلکہ ایک عظیم آدمی بن جاتا ہے۔ ایک طاقت بن جاتا ہے۔ ایک قوت؟ ---تم سن رہے ہو نا---''

''ہاں یار---''

ستیش بھٹناگر لڑکی کو لے کر بیٹھا تھا۔ وہ بار میں اکثر سروس کرنے والی لڑکیوں سے انٹرویو لیا کرتا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاس اور بغل میں لڑکی' جو اسے کھلا رہی تھی۔ اور اس کا گلاس بھر رہی تھی۔ خالی گلاس! جوان لڑکی۔ -- پھول سا بدن --- سبز اسکرٹ میں ملبوس اس کا سانولا جسم --- لڑکی بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ جیسے ساری زندگی وہ وہیں بیٹھی رہے گی اور خالی گلاس بھرتی رہے گی۔

''یار ستیش' ان لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے ان کی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ جب وہ پگھلتی ہیں تو سب کچھ بہا لے جاتی ہیں۔ اور جب سمٹتی ہیں تو پہلی رات کی دلہن بن جاتی ہیں۔ چھوئی موئی

پودے کی طرح۔۔۔ ایسی لڑکیوں پر کبھی اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔۔۔

میرے قریب جو لڑکی بیٹھی تھی وہ وہسکی کے رنگ کی ساڑی اور سوڈے کے رنگ کا بلاوز زیب تن کیے ہوئے تھی اور میں سگریٹ کی راکھ کی طرح دھیرے دھیرے اسے گرایا تھا۔ دھوئیں کی طرح اڑا رہا تھا۔ میں نے اس کی مکمل کہانی سن لی تھی۔ اس کا نام روپا تھا۔ اور وہ آدھی رات کے بعد بار بند ہوجانے پر اپنے جسم کو بستر بنالیتی ہے۔ اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے اور بھوک مٹانے کئی فرسٹریٹیڈ، بکھرے اور ٹوٹے ہوئے لوگ آتے تھے۔ وہ انھیں مطمئن کرتی تھی۔ تب کہیں جاکر اس کے گھر کے افراد مطمئن ہوپاتے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے اس بار میں نہیں پہنچی تھی بلکہ اسے اس بار میں پہنچنے کا راستہ اس کے پتا کے اپاہج پن نے بتایا ہے۔ سیوڑی کے ٹی بی ہاسپیٹل میں ایڈمیٹ اس کی ماں کی دوائیوں اور اس کی بہنوں کی کالج کی فیس نے یہ راہ سجھائی ہے۔ اس کے اس جرم میں اس کے گھر کا ہر فرد شامل ہے۔

آج وہ اپنے بوڑھے اپاہج پتا کی بیساکھی ہے۔ ماں کی دوائیاں ہے اور بہنوں کی فیس اور ٹافیاں ہے۔۔۔ وہ ملاڈ کی جھونپڑپٹی میں رہتی ہے۔ اپنے محلے میں شریف اور پاکباز ہے۔ گھر کی ذمہ دار وہی ہے اور سارا بوجھ اسی کے کندھوں پر آگیا ہے۔۔۔ تب سے وہ برف کی طرح پگھلنے لگی ہے۔

''تم پھر کہاں کھو گئے۔۔۔؟''

''کہاں۔۔۔ آں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ کہیں بھی نہیں۔''

دراصل میں انھیں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بساط الٹ چکی ہے۔ حکومت بدل گئی ہے۔ مگر دنیش جی کی باتیں ان کی یادیں، اب بھی تازہ ہیں۔ بھولنا چاہوں تو پھر یاد آجاتے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ بار میں جو لڑکیاں ہوتی ہیں، من گھڑت قصے سناتی ہیں۔ ہمدردی اور اپنائیت بٹورنے کی خاطر۔۔۔ ہر لڑکی کی کہانی ایک جیسی! ان کہانیوں کے کردار بھی ایک جیسے۔ لڑکیاں کسٹمر کو رجھانے، لبھانے اور دل بستگی کے لیے اور زیادہ سے زیادہ ٹپ حاصل

کرنے کے لیے ہمیں ایسی کہانیاں سناتی ہیں، گلاس بھرتی ہیں اور ہمارے جانے کے بعد پھر وہی کہانی دوسرے کسٹمر کو سناتی ہیں۔ روز کا یہ معمول ہے۔

ایک عرصہ پہلے میں اور دنیش جی اسی بار میں آتے تھے۔ جب کوئی لڑکی انھیں یہ کہانی سناتی تب وہ کہتے۔

''ہم کب آزاد ہوں گے۔ آخر کب تک ہم ذلیل ہوتے رہیں گے۔''

بس پھر وہ ایک مفکر کی طرح دور نکل گئے تھے۔ اس بار سے بہت دور۔۔۔ اور جب لوٹے تو لڑکی ان کا گلاس بھر چکی تھی۔

اور بس آزادی، مساوات اپنے حقوق کی بات سوچ کر ہی ان کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ اور غصہ چیونٹی کی طرح رینگتا ہوا چہرے تک آیا تھا۔ اور چیخے تھے چلائے تھے، فلک شگاف آواز میں۔۔۔ اس نکڑ ناٹک میں زمین دہل گئی تھی اور آسمان پر بے موسم بادل گرجنے لگے تھے۔ اور بس وہ ان کی آخری چیخ تھی۔ پھر کسی نے ان کی آواز نہیں سنی کیونکہ دشمن نے اس آواز کو ہمیشہ کے لیے دبا دیا تھا۔ خاموش کردیا تھا۔ الاو بجھ چکا تھا۔ اس میں چنگاری بھی باقی نہیں رہی تھی۔ مگر ہم آج بھی اس الاو کے گرد بیٹھے تھے۔

ستیش بھٹناگر ہنسنے لگتا ہے جو اس کی ہمیشہ عادت رہی ہے۔ وہ بہت کم سنجیدگی اختیار کرتا تھا۔ وہ زندگی کو شراب کا خالی گلاس تصور کرتا تھا۔ ہنستے ہنستے کہنے لگا۔۔۔ ''یار، تم بھی کہاں دقیانوسی خیالات کی پگڈنڈی پر نکل پڑے ہو۔ یہاں جو لڑکیاں آتی ہیں وہ ایک پہائی ہیں اور تمھارے ڈائریکٹر کی موت ایک نکڑ ناٹک، چھوٹا سا ڈرامہ۔۔۔ مگر ان غریبوں کی کہانیاں تو منصوبہ بندی ہوتی ہیں۔ ہر گاہک کے مطابق کہانی بدل جاتی ہے اور کردار جو بناوٹی ہوتے ہیں۔

مگر دنیش جی چرچ گیٹ پر یونیورسٹی کی عمارت کے پیچھے امپلائمنٹ دفتر کے قریب ہی وہ نکڑ ناٹک کر رہے تھے۔ بے روزگاری، کرپشن، مساوات اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے فٹ پاتھ پر مداریوں کی طرح لوگوں کو جمع کر رہے تھے۔ اور اپنا مقصد بیان کر رہے تھے۔

اس نکڑ ناٹک میں آزادی اور بیداری کی بات کی گئی تھی۔ زنجیروں کو توڑنے کی بات کی گئی تھی۔ یہ ناٹک بھی تھا۔ احتجاج بھی اور پیغام بھی۔ انھوں نے بھی اس میں ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ کیوں کہ وہ اچھے ڈائریکٹر ہی نہیں اچھے اداکار بھی تھے۔ پولس کو ان کی اداکاری پسند نہیں آئی۔ پھر لاٹھی چارج۔ اندھا دھند فائرنگ۔ - - اور بس اس روز جو ہوا وہی سین اس ناٹک میں نہیں تھا۔ دنیش جی پولس کی گولی کا شکار ہوگئے تھے اور ہم انھیں بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ کھڑے تھے۔ مجھے افسوس ہے۔ مجھے شرم سے بیر کے اس گلاس میں ڈوب مرنا چاہئے۔ کیونکہ میں انھیں بچا نہیں سکا۔ مجھے اپنے بزدل ہونے اور ڈرپوک ہونے کا شدید احساس ہے کہ ان کی لاش کو گھر تک نہیں پہنچا سکا۔ آج میں ان کی بیوہ جنھیں میں بھابھی کہتے ہوئے نہ تھکتا تھا اور ان کی لڑکیاں جو مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں ان سے نظریں نہیں ملاسکتا تھا۔

اس روز مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ دنیش جی صحیح معنوں میں اپنا پیغام عوام تک پہنچارہے تھے اور ہم سب صرف اداکاری کررہے تھے۔ ان زنخوں کی طرح جو ہمارے آس پاس رہتے ہیں اور مرد ہونے کا ڈھونگ کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے کردار کی بہت گہرائی میں اتر گئے تھے۔ اور انھوں نے اس کردار کو دریافت بھی کرلیا تھا۔ مگر ہم آج تک صرف ایکٹنگ ہی کررہے ہیں اور کردار کی عظمت کو پانے کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ آج بھی جب وہ منظر میری آنکھوں کے کیمرے میں آکر رک جاتا ہے تو میری آنکھوں سے گنگا جمنا بہنے لگتی ہیں۔ اور بس اسی وقت مجھے اپنی رذالت کا اور ان کی عظمت کا پتہ چل جاتا ہے۔ کردار کی عظمت کے نشانات مل جاتے ہیں۔ وہ واقعی مہان تھے۔ جنھوں نے اپنے اندر کے آرٹسٹ کو بھی مطمئن کردیا تھا۔ اور قصائی واڑہ کے معمولی آدمی کو بھی۔

میں ایک گہری سانس کھینچ کر شراب کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیتا ہوں اور بڑی آہستگی سے کہتا ہوں ''یار مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ جینے کا حوصلہ، اپنے حقوق کے لیے احتجاج، اہنسا کی تعلیم، اپنی بات کہنے کا موثر ڈھنگ، سلو لوکل

ٹرین میں سفر، ایل آئی جی کالونی میں داخل ہونے سے پہلے آنکھوں پر عینک چڑھانا، بلاؤ پل اور قصائی واڑہ کی پہاڑی پر جینس پتلون میں چڑھنا، اپنے سے طاقتور کے سامنے سچ بات پر کبھی نہ جھکنا، منترالیہ اور آکاش وانی کی بلڈنگ کے پیچھے یورینل تلاش کرنا، اور مرحوم سینئر آرٹسٹوں کے مزار پر اگر بتیاں جلانا، چادریں چڑھانا بغل میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی کہانی پر کبھی ایمان نہ لانا اور زندگی کو ایک وحشیانہ کھیل سمجھنا اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ میدان چھوڑ کر کبھی نہ بھاگنا۔ مگر میں تو انہیں میدان میں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا کیوں کہ بے باکی میں ان سے سیکھ نہیں پایا تھا۔ جو دنیش جی کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور وہ جس کا استعمال بھی بڑی بے باکی سے کیا کرتے تھے۔ میرے اندر سما نہیں سکی تھی۔''

میں چپ ہوگیا تھا۔ میں نے ویٹرس لڑکیوں کے ساتھ ساتھ اپنی ایک کہانی سنا دی تھی۔ بھٹناگر کو دیکھا جو چپ چاپ شراب پی رہا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ اور بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔

''یار مجھے بڑا دکھ ہوا۔ یہ کہانی سن کر آج پہلی بار ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کہانی تمہاری نہیں۔ لگتا ہے میری ہے ——————؟''

ہمیں ہر کہانی اپنی لگتی ہے۔ سب کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ان کے کرداروں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ آخر ایسا کیوں؟

میں نے محسوس کرلیا تھا کہ بھٹناگر کو شراب کا نشہ ہونے لگا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ دنیش جی کی موت پر شاید میں اتنا نہیں رویا تھا جتنا بھٹناگر رو رہا تھا۔

پھر میں نے اس کی بغل میں بیٹھی لڑکی پر نظر ڈالی اور پھر اپنے قریب بیٹھی لڑکی کو بغور دیکھا۔ میرا نشہ جاتا رہا۔ میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''چلو یار سٹیشن چلتے ہیں۔''

''اس طرح اچانک؟'' آخر ہوا کیا؟''

''بس چلو ـــــــ اس بار سے باہر ـــــــ فوراً اٹھو۔'' میں اسے کھینچنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بل پے کرنے اور دونوں لڑکیوں کو بڑی ٹپ دینے کے بعد ہم لوگ باہر چلے آئے۔ اور رکشا اسٹینڈ پر آ کر رک گئے۔

وہ پریشان تھا ''تم اس طرح بار سے کیوں نکل آئے؟''

''یار ستیش' وہ دونوں لڑکیاں جو ہمارے ٹیبل پر تھیں انہیں دیکھ کر مجھے کشمیر کی خوبصورت وادیاں یاد آگئیں۔ اس لیے میں اٹھ کھڑا ہوا۔'' ستیش دنیش جی کی یاد میں کچھ کہنے لگا۔ وہ لڑکھڑایا۔ مگر سنبھل گیا۔ پھر رکشا اسٹینڈ' تھیٹر' بس اسٹاپ پر کھڑی لڑکیاں' ٹریفک پوسٹ اور چہل پہل وہ دھڑام سے گر پڑا' میں نے بہ مشکل اسے اٹھایا۔

''تم کو چڑھ گئی''

''نہیں یار ـــــــ''

یہ بتاؤ' کیا ہم لوگ بار سے باہر آگئے ہیں؟''

''ہاں' باہر ہی تو ہیں اور گھر کی طرف جا رہے ہیں ـــــــ گھر!''

''نہیں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم ایک بار پھر بار میں داخل ہو رہے ہیں۔''

میں اپنے اطراف کا جائزہ لیتا ہوں تو یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی ہم بار میں داخل ہوئے ہیں۔ اسی بئیر بار میں ـــــــ!!
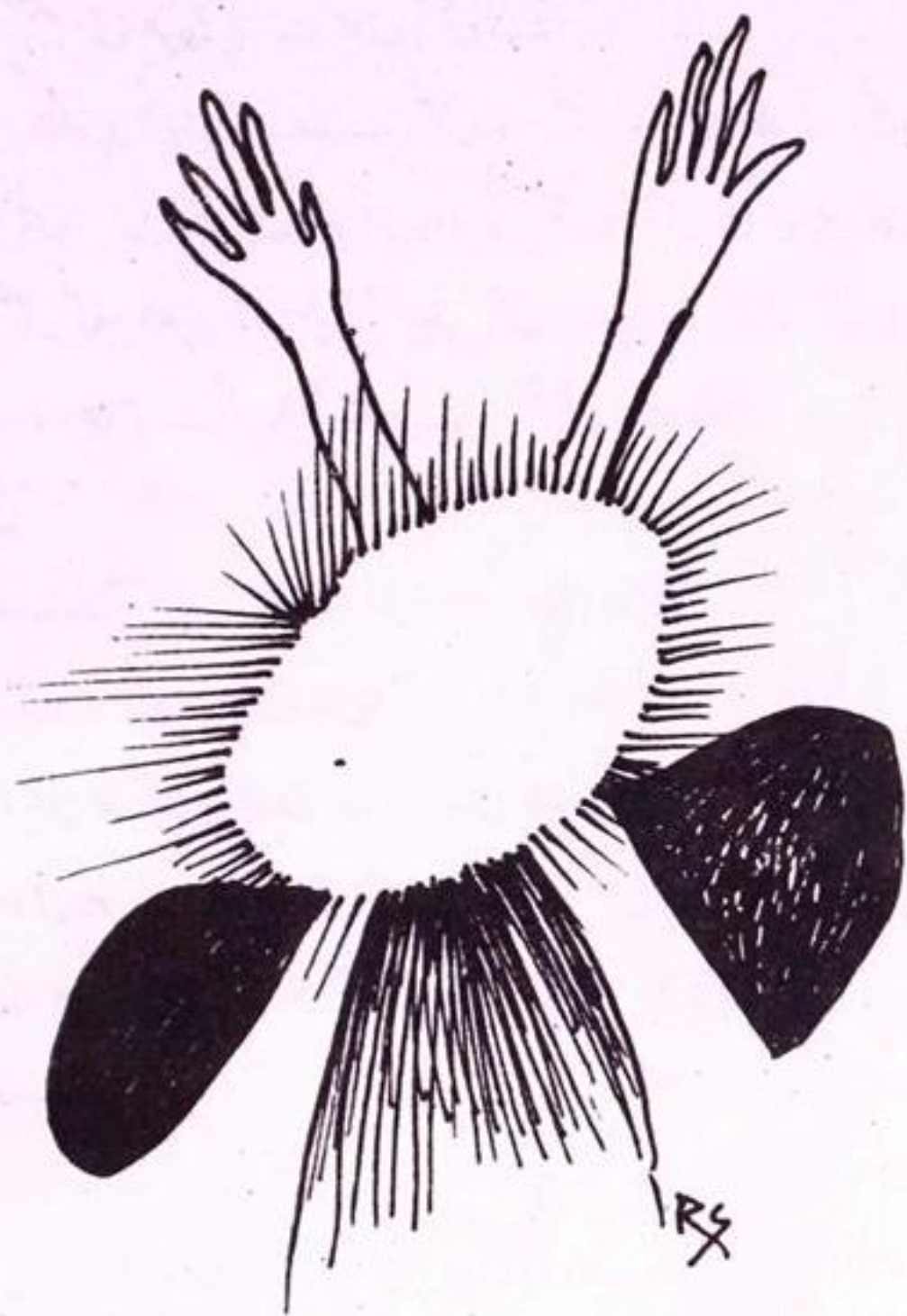
اپنے حصے کی دُھوپ

آسمان سے چلچلاتی دھوپ میرے اندر اتر رہی تھی۔ میں اُس کی جلن سے تڑپ رہا تھا چیخ رہا تھا۔ مگر میری چیخیں میرے ہی اندر دور بہت دور تک بے آب مچھلیوں کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ دم توڑ رہی تھیں۔

شاید...... صدیوں سے ـــــــــ !

میں نے تو زندگی میں صرف ٹھنڈی چھاؤں کی چاہت کی تھی۔ کچھ دیر ستا کر آگے بڑھنے کی آرزو کی تھی۔ میں نے تو صرف یہی چاہا تھا کہ ایک ہرے بھرے درخت کے نیچے ڈیرہ ڈال کر راحت و سکون کی چند گھڑیاں گزاروں اور ایک طویل سفر کی جانب چل پڑوں۔ مگر دھوپ مسلسل میرے اندر جذب ہو رہی تھی۔ سوتے جاتے، پل پل، لمحہ لمحہ، ایک صدی..... ایک اور صدی... جانے کتنی صدیاں بیت گئیں تھیں۔

کانکریٹ کے اس جنگل میں کافی دور چلنے کے بعد ستانے کی غرض سے میں ایک بس اسٹاپ پر رک گیا تھا۔ بس اسٹاپ پر جہاں میرے اور دھوپ کے علاوہ کوئی اور مسافر نہ تھا۔ دور دور تک صرف سناٹا بول رہا تھا۔ دھوپ اور سناٹا اور میں ایک ہی منزل کے راہی تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں

جیسے بھاڑ اور گھٹن زدہ ماحول سے آزاد ہو گیا ہوں۔ اکیلے پن کے کرب سے نجات مل گئی ہو مجھے۔

میں مسلسل چلتا رہا، چلتا رہا۔ چلتے رہنا ہی زندگی ہے اور رکنا موت۔ شاید اسی لئے میں زندہ تھا۔ زندگی کے ہر موسم میں۔ دھوپ میں بارش میں، سردی میں۔ بس زندگی کے سفر میں لمحہ لمحہ چلتا رہا۔ ان گنت صدیاں بیت چکی تھیں۔

بس اسٹاپ کی ٹوٹی پھوٹی چھت کے نیچے مجھے بہت سکون ملا تھا۔ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر میں وہیں بیٹھ گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے گھنے درخت کے چھاؤں کی چادر میرے سر پر تان دی ہو۔

پھر میں نے اپنی نظریں بس اسٹاپ کی طرف موڑ دیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ آخر میری منزل تک کس نمبر کی بس جائے گی۔ مگر میرے احساسات کو تعجب کا گرہن لگ گیا جب میں نے دیکھا کہ بس اسٹاپ پر کینسل تحریر تھا۔ میرے چہرے پر مایوسی کی پرچھائیں ناچنے لگی۔ میں بے چین ہو اُٹھا اور بڑبڑانے لگا۔ کیا واقعی یہ بس اسٹاپ کینسل ہے؟ کیا یہاں سے کوئی بس نہیں جائے گی۔؟ کل تک تو یہاں سے بسیں آتی جاتی تھیں۔ آج اچانک کیا ہو گیا کہ بسوں نے اپنا روٹ ہی بدل دیا۔

شاید۔ میں ہی لیٹ ہو گیا تھا۔ کل کو بیتے ہوئے تو ایک زمانہ گزر گیا تھا۔

پھر میں سوچنے لگا کہ ہر بار ایسا کیوں ہوتا ہے کہ مسافر اور بس اسٹاپ تو ہوتے ہیں۔ بسیں ہی نہیں آتیں۔ کنڈیکٹر تو ہوتے ہیں ڈرائیور غائب ہو جاتے ہیں۔

آخر کیوں....؟

اس کیوں کا جواب مجھے نہیں مل سکا تھا۔

میں اپنے آپ پر ہنسنے لگا۔ اپنے آپ پر ہنسنے میں مجھے اتنا مزہ آتا تھا اتنا مزہ آتا تھا کہ میں ہنستے ہنستے رو پڑتا تھا۔ پھر کہیں جا کر دل کو قرار آتا۔

میں بس اسٹاپ کی دیوار کے سہارے بیٹھ کر سانپ کی طرح لہراتی، بل کھاتی سیاہ سڑک کو بغور دیکھنے لگا۔ ایک لمبی سیاہ سڑک! جو صدیوں سے میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میں رکتا تو وہ بھی رک جاتی۔ میں چلتا تو وہ بھی چلنے لگتی۔ ٹوٹی پھوٹی، مڑی تڑی بالکل میری زندگی کی طرح ہے یہ سیاہ سڑک!

ایک دن اچانک دوڑتی بھاگتی کاروں، ٹیکسیوں اور بسوں کو میں رینگتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ گہما گہمی چہل پہل دیکھنے لگا۔ بھیڑ بھاڑ اور گھٹن کا ماحول ابھرنے لگا۔ ایک بہت لمبی سڑک اچانک جاگ گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے بہت تیزی سے میں نے اپنا سفر ختم کرلیا ہو۔ یا میں نے سفر شروع ہی نہیں کیا بلکہ تھک ہار کر بیٹھ گیا ہو۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ آنکھوں میں بس اندھیرا ہی اندھیرا تھا کچھ بجھائی نہ دیتا تھا۔ میں تو برسوں سے اس اندھے کنویں میں بند ہوں جس کی دیواریں آسمان کی چھت سے لگی ہوئی ہیں اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ میں آوازیں لگا رہا ہوں۔ ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔ مگر کوئی نہیں سنتا۔ کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ کسی کے بھی کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ میں اندھے کنویں سے باہر کھڑا ہوں اور خوش ہوں۔ ایک کامیاب زندگی کی طرف سفر کر رہا ہوں۔ میں ایسا مسافر ہوں جو مسلسل دلدل میں دھنستا جا رہا ہوں۔ حالانکہ میری زندگی جد و جہد اور مصیبتوں کی انگلی تھامے اس دھوپ زدہ بس اسٹاپ تک آ پہنچی تھی۔ جد و جہد بھی ایسی کہ عمر بھر میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ مصیبتیں بھی ایسی کہ ساری زندگی مجھ سے لپٹی رہیں۔ دھوپ سے بچنے کے لیے میں زندگی کی آخری گھڑی تک لڑتا رہا ہوں۔ لڑتا رہوں گا۔ ہر مورچے پر.....!

پھر میں اپنے اندر جھانکنے لگا۔ وہاں شہر کے علاوہ ایک گاؤں بھی بسا ہوا تھا۔ چھوٹا سا گاؤں! جو آہستگی سے، دھندلے دھندلے منظروں کے ساتھ باہر نکلنے لگا۔ ماں باپ اور دو بڑے بھائیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا خاندان! ہنسی خوشی زندگی بسر ہو رہی تھی۔ میرے لیے گاؤں میں بہت کچھ تھا۔ ندی کا کنارہ، کچے راستے، پگڈنڈیاں، کھیت کھلیاں، بیل گاڑیوں کے پہیوں کی چرچراہٹ، ٹریکٹر، ندی میں نہاتے بچے، پنگھٹ پر کپڑے دھوتی عورتیں، پتنگ اڑاتے اور گلی ڈنڈا کھیلتے لڑکے اور ان سب کے درمیان کہیں میں بھی؟....

پتاجی گاؤں کے زمیندار تھے۔ ان کی کھیتی باڑی تھی اور کئی باغ بھی تھے۔ بڑا سا گھر تھا۔ کوٹھی جائداد تھی جائداد تھی اور سبھی کچھ تھا۔ یہ سب میرے دادا کو انگریزوں نے وفاداری کا انعام دیا تھا۔ پتاجی نے ساری جائیداد کو سنبھال رکھا تھا۔ کبھی کبھار میں ٹریکٹر پر بیٹھ کر کھیتوں میں جاتا تو خوشی کا عجیب و غریب احساس ہوتا۔ خوب چہکتا، تتلیوں اور پتنگوں کے پیچھے دوڑتا۔ آم کے باغوں سے کچے

آم توڑ کر کھانے لگتا۔ مگر کھیتوں میں کھڑے اس آدمی سے بہت ڈرتا تھا جو گھاس پھوس سے کپڑے پہنا کر بنایا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی بجوکا کے اندر سے کوئی نکل پڑے گا اور دبوچ لے کر مجھ سے کہے گا۔ چلو اب تم میری جگہ کھڑے رہو...! یہ سب سوچتے ہی میں خوف زدہ ہو جاتا تھا اور بجوکا سے دور بھاگنے لگتا تھا۔

صدیوں سے میں بجوکا کے خوف سے مسلسل بھاگ رہا ہوں اور بجوکا میرا تعاقب کر رہا ہے۔ جب میں نے پتاجی سے بجوکا کے خوف کا ذکر کیا تو وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے۔ ''ارے پگلے...! بجوکا بھی کبھی زندہ ہوتا ہے وہ تو گھاس پھوس کا بنا ہوتا ہے۔ اس کے اندر بھی گھاس ہے اور باہر بھی گھاس!!

میں جس اسکول میں پڑھتا تھا اسے دادا کے عطیہ سے شروع کیا گیا تھا اور انہی کے نام سے وہ منسوب بھی تھا۔ اسکول سے لوٹ کر میں ندی کنارے چٹان پر بیٹھ کر بگلوں کو دیکھتا رہتا۔ کنارے پر بیٹھے مینڈکوں کو دیکھتا جو ٹرّاتے رہتے یہ منظر مجھے دلچسپ لگتا تھا میں ان کی طرف کھنچا چلا جاتا۔ ہر جگہ نوکر میرے ساتھ ہوتے۔ وہ بڑا خیال رکھتے تھے میرا۔ مجھ پر دھوپ نہیں آنے دیتے تھے۔ ماں اور پتاجی بھی مجھے دھوپ سے بچاتے رہتے۔ پتاجی ہمیشہ میرے سر پر بڑا سا رومال باندھ دیتے یا پھر چھتری کا سایا کر دیتے۔ میرے لیے ہیٹ Hat بھی منگوایا گیا تھا تاکہ دھوپ سے بچاؤ ہو سکے۔ مگر وہ مجھے پسند نہیں تھا۔ آج جب میں ماضی کی کتاب کے صفحات الٹتا پلٹتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب تو بچپن کی یادیں تھیں جسے میں فراموش نہیں کر پایا تھا۔

پتاجی مجھے بہت چاہتے تھے سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے میری ہر خواہش اور ضد پوری کی جاتی تھی میں سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ سب کا لاڈلا تھا۔ بہن صرف ایک ہی تھی۔ جس کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ سسرال میں بہت خوش تھی۔ میرے ایک بھائی نے میڈیکل کی ڈگری لی تھی اور دوسرے نے وکالت کی۔ وہ گاؤں سے قریب ہی شہر میں پریکٹس کرتے تھے۔ اور زمین جائیداد کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔ کیونکہ پتاجی بیمار رہنے لگے تھے۔ انھوں نے سب کچھ دونوں بھائیوں کے حوالے کر دیا تھا۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ ایک کار حادثے میں پتاجی کی موت واقع ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے

وقت کی سوئیاں اچانک رک گئی ہوں۔ آسمان سروں سے کھینچ لیا گیا ہو اور دھوپ کی چادر پھیلادی گئی ہو۔ غم کا پہاڑ ٹوٹ کر گرا تھا سبھی ایک گہرے صدمے سے دوچار تھے۔ ماں تو ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔

ابھی پتاجی کی چتا کی آگ ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی تھی کہ دونوں بھائی زمین جائیداد کے بٹوارے کے لیے آپس میں لڑ پڑے۔ ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ کہنے لگیں "بیٹا" سب کچھ تمہارا ہی تو ہے پھر یہ لڑائی کیسی؟....

ماں کو شک تھا کہ یہ کام دونوں بہوؤں کا ہے۔ مگر مجھے خوب پتہ تھا کہ دونوں بھائی دولت کے پجاری ہیں۔ خود غرض اور لالچی ہیں۔ بہوئیں تو بے چاری مفت میں بدنام ہو گئی ہیں۔ آپس میں جھگڑے، کورٹ کچہری کی دھمکیاں، تلواریں لاٹھیاں اور جائیداد کا بٹوارہ ـــــ !ان سب کی وجہ سے ماں ذہنی تناؤ میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ پتاجی کی موت نے انھیں ویسے ہی کمزور اور لاغر بنادیا تھا رہی سہی کسر بھائیوں کے جھگڑوں نے پوری کر دی تھی۔ پھر ہر چیز کا بٹوارہ ہوا۔ گھر، کوٹھی، دکان مکان، زمین جائیداد، روپیہ پیسہ، سونا چاندی سبھی کچھ....!

ماں تو جیسے زندگی سے مایوس ہو گئی تھیں انھیں تو جائیداد میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جائیداد کا حصہ بھی نہیں لیا ماں کا حصہ بڑے بھائی نے اور میرا حصہ چھوٹے بھائی نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ پتاجی کی موت کے بعد جائیداد کا بٹوارہ ماں کے لیے دوسرا گہرا صدمہ تھا۔ جس نے انھیں اس گھر اور گاؤں کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا وہ اپنے دل پر ایک بوجھ لیے وہاں سے نکل گئیں۔ میں ان کے ساتھ تھا اور پتاجی کی یادیں تھیں۔ جو انھیں حوصلہ دیتی تھیں۔ بس وہ روتیں اور آسمان کو تکتیں۔ لالچی بیٹوں کے لیے انھوں نے سب کچھ تیاگ دیا تھا۔

ہم شہر آگئے تھے یہاں ماں کے ایک منہ بولے بھائی تھے جو سگے بھائی سے زیادہ ماں کی عزت و احترام کرتے تھے۔ اچھے اخلاق و عادات کے انسان تھے۔ مخلص اور ملنسار بھی تھے۔ ان کی زندگی اولاد کے سکھ سے محروم تھی پھر بھی وہ خوش تھے۔ اور دکھیوں اور غم زدہ لوگوں کو خوش رکھنے کا ہنر خوب جانتے تھے۔

ماما نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ اپنا بیٹا ہی سمجھتے تھے ماں کو بہت سمجھایا کہ جائیداد کے جھگڑے تو

ہوتے ہی رہتے ہیں ماں کے زخموں پر مرہم رکھا، دلاسہ دیا، حوصلہ بڑھایا، جینے کی خواہش کو جگایا مگر ماں زندہ لاش کی طرح تھیں نہ ہنستیں نہ روتیں، نہ کچھ کہتیں۔ بس دور خلا میں نظریں گاڑے بیٹھی رہتیں۔

ماما نے مجھے شہر کے ایک اچھے اسکول میں داخل کرادیا۔ میں دل لگا کر پڑھنے لگا۔ کبھی کبھی ہم چھٹیوں میں گاؤں جاتے مگر بھائیوں کا رویہ ہمارے ساتھ اچھا نہیں ہوتا۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا جیسے بھائی یہ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ ادھر کا رخ ہی نہ کریں۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں انھوں نے کہہ بھی دیا تھا اور ہم نے محسوس کرلیا تھا۔

ماں کو اس بات سے کافی دکھ پہنچا تھا۔ وہ بیمار رہنے لگیں۔ دھیرے دھیرے ان کی بیماری میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ ماں کا علاج پابندی سے ہوتا رہا۔ بیماری کے بارے میں میں نے گاؤں اطلاع بھیج دی تھی۔ مگر وہاں سے کوئی نہ آیا۔ انھوں نے تو رشتہ ہی توڑ لیا تھا۔ بھائیوں کا خون سفید ہوچکا تھا۔ بھابھیاں مجبور تھیں وہ جائیداد ہڑپنا چاہتے تھے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوگئے تھے۔

برسوں بعد یوں ہوا کہ ماں بھی پرلوک سدھار گئیں میں پھر اکیلا ہوگیا .... ایک دم اکیلا..... میں نے پھر کبھی گاؤں کا رخ نہیں کیا۔ مگر یہ احساس بار بار کچوکے لگاتا رہا کہ جائیداد کا حصہ اس طرح چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔ خود غرض اور مطلب پرست بھائیوں سے چھین لینا چاہیے تھا مگر میں کیا کرتا جن بھائیوں نے ماں کو اتنے دُکھ دیئے کہ وہ آخری وقت تک بیٹوں کو دیکھنے ترستی رہی دیدار کی اسی پیاس لیے دنیا سے رخصت ہوگئیں ان سے کیا تعلق رکھنا۔ میرے دل میں بھی ان کے لیے خلوص باقی نہیں رہا تھا۔ ماں کی موت کے ساتھ ممتا کی ٹھنڈی چھانو سے میں تیز، آگ برساتی دھوپ میں آگیا تھا۔

کالج کی تعلیم کے بعد میں ایک بڑی فرم میں ملازم ہوگیا تھا اور ماما جی نے میرے سر پر شفقت کا سائبان رکھ دیا تھا اور دھوپ کی چادر کھینچ لی تھی۔ اس کے باوجود آسمانی چھت سے قطرہ قطرہ دھوپ ٹپک کر سمندر بن گئی اور اس سمندر میں میں ہاتھ پیر چلاتا رہا۔ غوطے کھاتا رہا۔

صدیاں بیت چکیں۔

حالات کے تھپیڑوں نے مجھے ایک دم اکیلا کردیا تھا۔ بھائیوں کے سلوک نے میرے دل پر

گہرے زخم لگائے تھے۔ میں وقت سے پہلے بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ میں اپنے آپ میں جینے لگا تھا۔ ایک دم الگ تھلگ ....! تنہائیوں کو دور کرنے کے لیے ماما جی نے بہت کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔ وہ فکر مند رہتے تھے کہ میں کس طرح اندھیروں سے باہر نکل آؤں۔ اسی لیے وہ مجھ پر توجہ کرتے، ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔

مگر میں تو زندگی سے مایوس اور ناراض ہو چکا تھا۔ تبھی میری خالی خالی زندگی میں مامی کی بھتیجی سواتی داخل ہوگئی وہ میری ہر مصیبت کو اپنی مصیبت اور ہر درد کو اپنا درد سمجھنے لگی تھی۔ وہ میرے لیے بے چین رہتی تھی۔ میرا انتظار کرتی اور راتوں کو میرے لیے جاگتی تھی۔ اس کا دل میرے اندر اور میرا دل اس کے اندر دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ قطرہ قطرہ دھوپ چاہے سمندر بن جائے مگر اس دھوپ سے بچنے کے لیے سائبان اب بھی موجود ہے۔ سواتی کے روپ میں! کیونکہ اب تک جتنے بھی سائبان تھے وہ تیز دھوپ میں جھلس گئے تھے مگر یہ سائبان دھوپ کے تھپیڑے سہہ کر بھی محفوظ تھا۔

پھر ایک دن میں اس سائبان کی پناہ میں چلا گیا۔ سواتی مجھ سے بہت پیار کرتی تھی اور میں بھی اس کے جذبات کو اپنی روح میں محسوس کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے اور ہم دونوں زندگی کی تیز دھوپ سے بچنے کے لیے ایک دوسرے کا سائبان بن چکے تھے۔

ماما اور مامی بہت خوش تھے۔ ان کی ساری فکریں دور ہو گئی تھیں۔ بغیر ماں باپ کی لڑکی کو ایک سہارا مل گیا تھا۔ سواتی کے ماں باپ ایک یاترا پر جاتے ہوئے ٹرین حادثہ میں ہلاک ہوگئے تھے۔ تب سے سواتی ماما کے پاس ہی تھی۔ وہ اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہتے تھے۔ اس پر ڈھیر سارا پیار نچھاور کرتے تھے۔ اُسے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ یتیم ہے بے سہارا ہے۔

میری زندگی سنوارنے کے لیے سواتی نے سب کچھ لٹا دیا تھا۔ مجھے مایوسیوں کے اندھیرے سے نکالنے کے لیے خود اندھیروں میں گم ہوگئی اس کی یادوں کے اجالے میرے پاس محفوظ تھے۔

شادی کے دو سال بعد ہمارے گھر ایک خوبصورت بیٹا پیدا ہوا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میری مایوس زندگی میں پھر سے بہار آگئی۔ زندہ رہنے کی امنگ پھر سے جاگ اٹھی۔ میں اپنے ماں باپ

کی موت اور بھائیوں کے فریب کو بھی بھول گیا۔ سواتی اور پرکاش نے میری زندگی میں خوشیاں بھر دی تھیں۔ وہ دونوں میرا سکھ چین ہی نہیں بلکہ میری زندگی، میری دھڑکن بن گئے تھے۔

آفس سے آنے کے بعد ہم خوب کھیلتے، ہنستے ہنساتے، چہکتے، چہل قدمی کے لیے باہر جاتے، کسی ہوٹل میں کھانا کھاتے۔ پرکاش کے ساتھ آئس کریم کھاتے۔ بچپن کی طرف نکل پڑتے۔ ایسا لگنے لگا تھا جیسے زندگی میں خوشیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ ہم دونوں اس بوچھار سے بھیگتے چلے جارہے تھے۔ سواتی کے قدم مبارک تھے۔ اس کے آتے ہی میرا پروموشن ہوگیا تھا۔ پہلی بار میرے اندر یہ احساس جاگ اٹھا تھا کہ دھوپ کے سائے گھٹتے جارہے ہیں۔ سائبان بڑا اور بڑا ہوتا جارہا ہے۔

پھر ایک دن اچانک سواتی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر سے چیک اپ کرایا گیا۔ ڈاکٹر نے تو اطمینان دلایا مگر میری پریشانی بڑھنے لگی۔ شک بھی ہوا کہ کہیں مرض خطرناک نہ ہو۔ جوں جوں پرکاش بڑا ہورہا تھا ویسے ویسے سواتی کی بیماری بھی شدید ہوتی جارہی تھی۔ وہ اب پہلے سے زیادہ بیمار رہنے لگی تھی۔ بے حد کمزور ہوگئی تھی۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ چہرہ پیلا پڑتا جارہا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر نے کہہ ہی دیا کہ انھیں ٹی بی ہے۔ یہ بیماری بہت زیادہ خطرناک نہیں ہے اس کا علاج تو آسان ہے۔ بس دوائیاں پابندی سے لی جائیں۔ پرہیز کیا جائے۔ ٹینشن سے دور رہا جائے تو بیماری پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ مگر اس بیماری نے تو سواتی کو اندر سے کھوکھلا کردیا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آنے لگی تھی اسے دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی مجھے لگا جیسے ایک بار پھر کوئی سر سے سائبان چھین رہا ہو اور میں دھوپ کے سمندر میں ڈوب رہا ہوں۔ ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔

ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا کہ انھیں کوئی ٹینشن نہ دیا جائے۔ میں جانتا تھا کہ اس کی پریشانیاں اور بے چینیاں صرف میرے متعلق تھیں میری زندگی سنوارنے کے لیے سواتی نے سب کچھ لٹادیا اکیلے پن کو دور کرنے اور مجھے اندھیروں سے نکالنے کے لیے خود اندھیروں میں گم ہوگئی۔ وہ مجھے خوش رکھنے کے لیے ٹینشن میں مبتلا ہوجاتی تھی۔ اس کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا تھا اور اسی نے ایک دن اس کی جان لے لی۔ وہ بھی خاموشی کے ساتھ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ میں خوب رویا، اور اپنے آپ کو ایک بار پھر اندھیروں میں بھٹکتا محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ اجالے تو سواتی اپنے ساتھ لے گئی اور اندھیرے چھوڑ گئی

تھی۔اب میں تنہا ہو گیا تھا۔ تنہائی میں سواتی کو خوب یاد کرتا اور اپنے اندر زار و قطار روتا۔اس کا ساتھ مختصر تھا مگر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ہم جنم جنم کے ساتھی تھے اب اس کی یادیں ہی میری زندگی کا سرمایہ تھیں۔ جس کے سہارے میں اپنی اندھیری زندگی کو نور سے سجا رہا تھا۔اس نے پرکاش کے روپ میں ایک بہت اچھا تحفہ مجھے دیا تھا۔ جس کی پرورش اور حفاظت اب میری ذمہ داری تھی اس کی زندگی سنوارنا اُسے دھوپ سے بچانا میرا مقصد بن گیا تھا۔

پرکاش اسکول جانے لگا تھا۔ ماما اور مامی اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی رہنے لگے تھے۔ ماما ریٹائر ہو چکے تھے۔انھیں بے اولاد ہونے کا کرب دیمک کی طرح کھائے جا رہا تھا مگر پرکاش کی کلکاریوں نے ان کی ویران زندگی میں خوشیاں بھر دی تھیں۔ وہ دن بھر پرکاش کے ساتھ مصروف رہتے کھلیتے کودتے ، بھاگتے دوڑتے اور خوب ہنستے۔ پرکاش کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ دونوں نے اسے ماں کا احساس بالکل نہیں ہونے دیا۔ پرکاش کو سائبان مل گیا تھا اور میں بے آسمان ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں تقدیر میرے ساتھ ایسا گھناؤنا مذاق کیوں کر رہی تھی۔ ہر بار میرے سر سے شفقت اور محبت کا سایہ چھین لیا جاتا تھا۔ میں جسے بھی چاہتا ٹوٹ کر چاہتا اُسے میری زندگی سے دور کر دیا جاتا۔ مصیبتیں، تکلیفیں، دکھ اور درد میرے ہی حصے میں کیوں چلے آتے۔ قطرہ قطرہ دھوپ میرا ہی تعاقب کیوں کر رہی تھی۔ دھوپ جب آسمان سے اترتی تو میرے ہی سائبان کو جلا کر راکھ کیوں کر دیتی تھی۔ آخر کیوں......!!

میں یادوں کے سہارے زندگی کی تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔ مگر بدنصیبی میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ پرکاش کی پرورش میں سب کچھ بھول گیا تھا میں نے پیچھے کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا اور نہ ہی اس دھوپ کو دیکھا جو آسمان سے نیچے اترتی رہی تھی۔ میں تو آگے ہی بڑھتا رہا۔ بہت آ۔

ماما اور مامی نے بہت اصرار کیا کہ دوسری شادی کر لو، اکیلا پن دیمک ہو جائے گا۔ مایوسیوں اور اداسیوں کے اس کھنڈر سے باہر نکل آؤ گے۔ مگر میں پرکاش کے لیے سوتیلی ماں لانا نہیں چاہتا تھا۔ سوتیلی ماں تو خود ایک بہت بڑا کرب تھا۔ پرکاش تو ایک دم معصوم، خوبصورت بچے کی مانند تھا جسے چھاؤں کی زیادہ ضرورت تھی۔اس سے کئی امیدیں وابستہ تھیں۔

دھوپ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے برسوں بیت گئے۔ اکیلے پن کی اب مجھے عادت ہو گئی تھی۔ سواتی کی یادیں میرے ساتھ ساتھ ہوتیں جس کے سہارے میں نے پہاڑ جیسی زندگی کاٹ دی تھی۔

اب میں ریٹائر ہو چکا تھا اور ٹھنڈی چھانو میں بیٹھ کر دھوپ زدہ زندگی پر قہقہے لگانا چاہتا تھا۔ میرا جی سرگوشی کرتا کہ میں خوب ہنسوں اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاؤں مگر میں ایسا کر نہیں پاتا تھا کیونکہ میں نے ساری ہنسی اور سارے قہقہے پرکاش پر نچھاور کر دیئے تھے۔ زندگی کی دھوپ اپنے لیے رکھ چھوڑی تھی اور چھاؤں کے سائبان پرکاش کے لیے۔

اب پرکاش کمپیوٹر انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر کے زندگی کے میدان میں اتر چکا تھا۔ پرکاش کو دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوتا، بڑا سکون ملتا تھا میں اس کی خوشی میں خوش ہوتا۔ مجھے لگتا جیسے میں کسی سائبان کے سائے میں بیٹھا دھوپ کا منظر دیکھ رہا ہوں۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ پرکاش نے جھجکتے ہوئے کہا....

پتا جی.....! میں کچھ کہنا........!

ہاں کہو.... بیٹا...... کیا کہنا چاہتے ہو......؟

میں امریکہ جانا چاہتا ہوں..... امریکہ کی ایک مشہور کمپنی میں اپلائی کیا ہے۔ میرا سلیکشن یقیناً ہو جائے گا۔

کیا......؟ امریکہ........؟

ہاں.... اس نے کہا۔

یہ سن کر میں حواس باختہ ہو گیا۔ پیروں تلے کی زمین دلدل ہو گئی میں اندر ہی اندر دھنسنے لگا۔ کئی قلعے ٹوٹ گئے۔ کئی محل کھنڈر بن گئے۔ میں شش و پنج میں مبتلا رہا اور سوچنے لگا کہ اگر میری تقدیر میں دھوپ ہی ہے تو اسے میں اپنے بیٹے پر کیوں آنے دوں؟ میں تو قطرہ قطرہ دھوپ کا زہر پی رہا ہوں صدیوں سے!!

ایک گہری سوچ کے بعد پرکاش سے مخاطب ہوا۔ بیٹا..... تو کیا تم سچ مچ امریکہ جانا چاہتے

ہو.....؟

ہاں..... پتاجی۔ اس دیش میں کیا رکھا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔ غریبی، مہنگائی، بھوک، مفلسی اور دھوپ! اور کب تک ہم اس دھوپ کا شکار ہوتے رہیں گے؟ آخر کب تک.....؟ پتاجی، سنہری مواقع میرا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر میں جان بوجھ کر ان سے منھ کیوں موڑوں؟ مجھے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے نا.....اور میں وہی کر رہا ہوں۔

تو ٹھیک ہے بیٹا..... جیسا تم مناسب سمجھو.....!

میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر حامی بھر لی تھی۔ کیونکہ آج تک اس کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کی تکمیل کرتا آیا تھا۔ میں اس کی ضد اور خواہشات کے آگے اپنے آپ کو ہمیشہ بے بس پاتا تھا۔ آج بھی میں اسے روک نہیں پایا۔ اپنے مفاد اور آرام کے لیے میں اس کا مستقبل تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے میں اسی جگہ پر آگیا ہوں جہاں تیس برس پہلے کھڑا تھا۔ اس بجوکا کی طرح جو آگ برساتے ہوئے آسمان کے نیچے کھڑا جلس رہا تھا۔ مگر بے حس و حرکت، بے جان۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے یوں لگا جیسے گاؤں کے اس کھیت سے نکل کر بجوکا میرے اندر ہی کہیں آکر بس گیا تھا اور دھوپ کے کہ میرے خیالات کو جھلسا رہی تھی۔

پھر اچانک میری سوچ کے سلسلے کو کسی نے توڑ دیا۔ میں نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو پروہت جی تھے جو ہاتھ میں فائل، بغل میں چھتری دبائے پتہ نہیں کب سے میرے قریب ہی کھڑے تھے۔

مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے..... کہاں کھو گئے تھے آپ.....؟

کسی گہری سوچ میں غرق تھے.....شاید؟

اس ٹوٹی پھوٹی چھت نے تو آپ کو دھوپ میں نہلا دیا۔ ہاں..... ذرا دور نکل گیا تھا... پگڈنڈیوں، ٹیڑھے میڑھے راستوں اور تارکول کی سڑکوں سے گزر کر کانکریٹ کے اس جنگل میں پہنچا ہوں۔ اسی لیے سورج کی تپش کا احساس بھی نہ ہوا۔

"مگر آپ یہاں کہاں.....؟"

"زندگی کی تلاش میں۔!"

''آپ بھی......ہاں''

''آپ کا بیٹا تھا نا.....؟''

''ہاں....وہ امریکہ چلا گیا''۔

''اور آپ کا بیٹا.....؟''

''وہ شادی کے بعد ہم سے الگ ہو گیا.....!''

''کیاں.......ہاں....؟

گہری خاموشی........؟

پھر دونوں ایک دوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملا رہے تھے۔

کہ اچانک BEST کا ایک ملازم وہاں پہنچا جس کے ایک ہاتھ میں رنگ کا ڈبہ اور دوسرے میں برش تھا پہلے تو اس نے ٹوٹی پھوٹی چھت کو نکالا پھر کینسل لفظ پر برش پھیر کر نیا روٹ نمبر لکھنے لگا۔

چھت کے ہٹتے ہی دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔

لیکن نیا روٹ نمبر دیکھ کر دونوں کے چہرے اچانک کھل اٹھے...!

OO

نیا منظر نامہ

اور پھر گاؤں کے نیم خوابیدہ لوگ ہتھیاروں سے لیس واپس اپنے گھروں کی جانب لوٹ گئے۔ دروازے بند کر کے اپنی بیویوں کے پہلو میں سو گئے کبھی نہ جاگنے کے لیے۔ شاید وہ جاگنا نہیں چاہتے تھے یا وہ سونا ہی چاہتے تھے ـــــ

اور پھر ـــــ صدیوں بعد ایک چیخ فضا میں ابھری اور بند کواڑوں پر دستک دیتی ہوئی ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ اس چیخ نے برسوں بعد ان کواڑوں کی زنجیروں کو ہلایا تھا اور اندھیرے کمروں کا رخ کیا تھا۔ برسوں بعد ان تاریک کمروں میں سوئے ہوئے جسموں میں حرکت ہوئی اور وہ چیخ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح ان کے جسموں میں پیوست ہو گئی تھی ـــــ

گاؤں کے جو لوگ سو رہے تھے نہ جانے کب سے سو رہے تھے۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اپنی خمار آلود اور چپ چپی آنکھیں ملتے ہوئے اپنے آپ کو ٹٹولنے لگے۔ جب انھیں یہ اطمینان ہو گیا کہ ان کا اپنا آپ ان کے اپنے ہی پاس موجود ہے ـــــ تو پھر وہ مکمل طور پر جاگ گئے ـــــ صدیوں بعد وہ ایک طویل اور تھکا دینے والی نیند سے جاگے تھے یا ان کا ایک بار پھر جنم ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کی زمین میں پتہ نہیں کیسے کیسے المناک منظر دفن تھے۔ شاید اسی لئے ان کی آنکھوں کے اندر خواب جنم لینے سے پہلے

ہی ختم ہو جاتے تھے۔ ان کی زندگی کے ساتھ یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ وہ جب بھی سوتے تھے خواب ان کی آنکھوں سے دور رہتے تھے۔

اور پھر انھوں نے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹا اور اپنے اندر کی ساری تاریکی اپنی بیویوں پر انڈیل دی۔ اور جاگتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا بند کواڑوں کی طرف ـــــ بند کمروں میں رکھے ہوئے ہتھیاروں کی طرف جنھیں ان کے آباواجداد نے اس اندھیر نگری میں سجا رکھا تھا جسے وہ وقت ضرورت استعمال بھی کر لیا کرتے تھے۔ جب کبھی شیر جنگل سے نکل کر گاؤں میں داخل ہوتا اور گاؤں کی بھیڑ بکریوں اور معصوم جانوروں پر حملہ کرتا تو اس وقت یہ گاؤں کے نیم خوابیدہ لوگ جاگ جاتے اور لاٹھیاں، تلواریں، بھالے اور بلّم وغیرہ کا آزادانہ استعمال کرتے تھے۔

آج پھر ان سجے ہوئے ہتھیاروں کے استعمال کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ انھوں نے ہتھیاروں کو مضبوطی سے تھام لیا تھا جیسے ہتھیار ان کے بازو ہوں۔ دروازوں سے گرد کی تہہ ہٹا کر وہ باہر نکل پڑے۔ دھڑام کی آواز کے ساتھ دروازے بند ہوئے، کھڑکیاں تو پہلے ہی سے بند تھیں۔ گرد اور مٹی صاف ہوئی، خاموش سناٹوں نے شاید پہلی بار اپنے جسم پر شور کے تازیانے پڑتے ہوئے محسوس کیے۔

راستے چل پڑے ـــــــ !!

انھوں نے بند کمروں کے اندر بیٹھے بیٹھے اندازے کے تیر پھینکے تھے اور چیخ کی سمت کا تعین کر لیا تھا۔ ان گنت نیم خوابیدہ لوگ اپنے ہاتھوں میں ہتھیار لیے اس سمت بڑھ رہے تھے جہاں سے چیخ سنائی دی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک چوراہے پر رک گئے تھے۔ کچھ ادھیڑ عمر کے تجربہ کار لوگ جنھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ یا تو سونے میں گنوایا تھا یا پھر مہلک ہتھیاروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے تھے ـــــ کہنے لگے.... شاید یہ چیخ گاندھی نگر کی اور سے آئی ہے کیونکہ جب سے وہاں پر گاندھی جی کے مجسمے کی آنکھیں غائب ہوئی ہیں تب سے اس نگر میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ وہاں کے لوگ اجالے کے لیے مسلسل چلا رہے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے اس نگر سے ساری دنیا کو روشنی ملی ہے آج وہاں اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ "نہیں ـــــ! کچھ نوجوان، جنھوں نے ابھی ابھی سونا سیکھا تھا اور جو ٹھیک سے جاگے بھی نہیں تھے کہنے لگے....

یہ چیخ صرف گاندھی نگری کی نہیں ہے بلکہ اس نگری کی ہے جہاں کا ہر آدمی سو رہا ہے یا جاگنے اور سونے کی کیفیت سے دوچار ہے ـــــ ہمیں تو لگتا ہے یہ چیخ ہمارے اپنے اندر ہی کہیں سنائی دے رہی ہے جسے ہم سن کر بھی ان سنی کر رہے ہیں۔ کچھ بزرگ ـــــ تم بے وقوف ہو یہ چیخ اس جگہ سے آئی ہے جس سے ہم سب آشنا ہیں۔ یعنی ندی کنارے سے، جس کے اس طرف ایک جنگل ہے جہاں وہ شیر رہتا ہے جو وقتاً فوقتاً بھیڑ بکریوں پر حملے کرتا ہے۔

اب نیم خوابیدہ لوگ ایک دوسرے کی رائے سے نہیں بلکہ خود اپنی رائے سے اختلاف کرنے لگے تھے۔ پھر بڑی مشکل سے یہ طے ہوا کہ ہو سکتا ہے یہ چیخ ندی کنارے سے آئی ہو۔ جہاں پر وہ گڈریا ،بھیڑ بکریوں کو چرا رہا ہو گا۔ اور پھر نیم خوابیدہ لوگ اس ندی کی طرف چل پڑے۔

ـــــ تیز تیز قدم بڑھاتے،

ـــــ دھول مٹی اڑاتے،

ـــــ راستوں کو جگاتے ہوئے،

وہ سب اپنے ہاتھوں میں ہتھیار لئے ہوئے ندی کنارے پہنچے تو انھیں وہاں سناٹا دکھائی دیا۔ ان کی آنکھوں نے تعجب کی جھاڑیاں، حیرت کے اونچے درخت اور ایک پُراسرار ندی دیکھی جو غریب کی زندگی کی طرح بڑی آہستگی سے رواں تھی۔ جس کے کنارے صرف وہی گڈریا بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا اور زندہ تھا۔ پتہ نہیں اسے شیر اٹھا کر کیوں نہیں لے گیا تھا۔ لوگوں کے لیے اس کا زندہ رہنا تشویش ناک تھا۔ وہ گڈریا اپنی دُھن میں مگن تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ـــــ

آج گڈریے کی چیخ پر وہ لوگ بیویوں کے جسموں سے چادر کو علاحدہ کر کے جاگ گئے تھے۔ پھر انھوں نے اپنی جاگتی ہوئی آنکھوں کو جاگتے ہوئے مناظر کی طرف موڑ دیا ـــــ ندی بڑی آہستگی سے بہہ رہی تھی۔ ندی کے کنارے خوبصورت اور معصوم بھیڑ بکریاں جمع تھیں۔ کچھ چر رہی تھیں کچھ آنکھ مچولیاں کھیل رہی تھیں۔

اور گڈریا بہت آرام اور بے فکری سے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا ـــــ لوگوں نے یہ منظر کئی راتوں کو صبحیں اور کئی صبحوں کو راتیں بنانے کے بعد دیکھا تھا۔

گڈریے نے جب نیم خوابیدہ دنوں کے مختلف گروہوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر ہتھیار لیے کھڑا دیکھا تو اس کی سیٹی گم ہو گئی اور اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ شاید اس نے پہلی بار ایسا منظر دیکھا تھا، پہلی بار گاؤں کے یہ لوگ جاتے تھے۔ مگر اس کا دل و دماغ اس امر پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ پھر اس نے تعجب اور حیرت سے کہا۔ "اے بند کمروں کے مکینو! کیا آپ کے ہتھیاروں کا زنگ دور ہو گیا ہے یا آپ نے سونا چھوڑ کر جاگنا شروع کر دیا ہے؟"

نیم مردہ جسموں کے خشک اور کھردرے ہونٹ ہلے۔ "اے گڈریے! ہم تو سو رہے تھے اور کب سے سو رہے تھے اس کا ہمیں پتہ نہیں۔ آج تک ہم نے جاگنے کی کوشش بھی نہیں کی مگر تمہاری دل دوز اور فلک شگاف چیخ نے ہمیں جھنجھوڑ دیا اور ہم جاگ گئے ——— جانتے ہو تم کیا کہہ رہے تھے ——— بچاؤ بچاؤ! شیر آیا شیر آیا ——— اور ہمیں وہی پرانی کہانی یاد آ گئی جس میں ہم تمہاری مدد کو نہیں پہنچے تھے اور شیر تمہیں کھا گیا تھا ——— ہے نا ——— کیا واقعی شیر ایک بار پھر آیا ———؟ کس طرف گیا بتاؤ؟ آج وہ بچے گا نہیں ——— اگر وہ گاؤں میں گھس گیا تو تباہی و بربادی پھیلا کر کسی بھونچال کی طرح گزر جائے گا۔ اسی لئے ہم تمہاری اور ہماری حفاظت کی خاطر ہتھیار لیے اکٹھا ہوئے ہیں ———!!

گڈریے نے ان کے بکھرے ہوئے وجود اور مسخ شدہ چہروں کو تفصیل سے پڑھا، برسوں سے وہ پڑھتا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی جینز کی پتلون کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی سگریٹ ہونٹوں تلے دبا کر سلگائی اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ میں آپ کے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ مگر اے لوگو! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو مدد کے لیے پکارا ہی نہیں اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر میں کیوں پکاروں؟ کیا ضروری ہے کہ میں آج بھی آپ کو اسی طرح مدد کے لیے پکاروں شاید میں نے برسوں سے ان بھیڑ بکریوں کو نہیں پکارا اور نہ ہی ان کا ایک ریوڑ بنانے کے لیے کبھی آواز لگائی ——— بلکہ ان معصوم جانوروں میں خود بخود ڈسپلن پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اپنی حد میں ہی چرتے ہیں اور واپس لوٹ آتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ ابھی تک پرانی کہانی کے گورکھ دھندے میں ہی پھنسے ہوئے ہیں۔ ابھی تک وہیں ہیں۔ برسوں پرانی کہانی کے اندر۔ آج بھی آپ لوگ شیر کو مارنے کے لیے لاٹھیاں، تلواریں، اور وہ سب ہتھیار جو گھروں میں ہوتے ہیں لائے ہیں۔ ہاں۔ ہو سکتا ہے برسوں پہلے میں نے آپ کو مدد کے

لیے پکارا ہو ——— آپ آئے ہوں اور مجھے شیر کھا چکا ہو۔ مگر اب زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہ بارودی ہو گیا ہے۔ سانس لینا دوبھر — فضا میں جیسے کسی نے زہریلی گیس چھوڑ دی ہو۔ ایسے ماحول میں میں نے اپنی حفاظت خود کرنا سیکھ لیا ہے۔ شاید آپ نے اس طرف توجہ ہی نہ دی۔ کیونکہ آپ تو سو رہے تھے۔"

پھر اس نے کندھے سے لٹکی ہوئی دونالی بندوق ان کو دکھائی۔ سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ دیا جیسے بندوق سے آسمان کی طرف فائر کیا ہو۔ گڈریے کی اس تبدیل شدہ حالت کو دیکھ کر لوگوں کو اپنے ہاتھوں کے ہتھیار اچانک زنگ خوردہ لگنے لگے اور وہ سوچنے لگے کہ کیا وہ واقعی سو رہے تھے ———"

پھر انھوں نے دیکھا کہ بھیڑ بکریاں بڑی آزادی سے جنگل کی گھاس چر رہی ہیں اور بندوق سنبھالے گڈریا بیٹھا ہے۔ انھوں نے خوف ناک جنگل کی طرف دیکھا جہاں شیر رہتا تھا جو برسوں پہلے گڈریے کی بھیڑ بکریوں کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ یا لے جاتا رہا ہے۔ پھر لوگوں نے ندی کو دیکھا۔

—— "ہمیں ہر بار ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ تم مر چکے ہو۔"

—— "ہمیں ہر بار ایسا کیوں لگتا ہے کہ تمہیں شیر اٹھا کر لے گیا اور بکریوں کو بھی لے جائے گا۔"

—— "ہر بار تم اس کہانی سے باہر کیوں نکل جاتے ہو؟"

—— "ہر بار تمہاری چیخ فضا میں ابھرتی اور غائب ہو جاتی ہے"

"یہ آپ کا وہم ہے۔ آج بھی آپ لوگ اسی پرانی کہانی میں مقید ہیں۔ مگر میں آج بھی زندہ ہوں اور ان معصوم بے زبانوں کی حفاظت کر رہا ہوں۔ اپنی زندگی سے زیادہ مجھے ان کی زندگی عزیز ہے۔ ان کی تحفظ میرا ایمان ہے اور شیر جب بھی اس طرح آئے گا میں فائر کر دوں گا ——— ؟

اب ان کے نیم خوابیدہ ذہنوں پر یقین کی گرد جمنے لگی۔ ان کی آنکھوں کے کیمرے میں نیند اپنا عکس اتارنے کے لیے بے چین تھی ——— اب انھیں یقین کامل ہو گیا کہ جب بھی شیر گاؤں میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا گڈریا اسے بھون کر رکھ دے گا۔ پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں بے فکر ہو کر سو جانا چاہیے گڈریا جاگ رہا ہے تو ہمیں جاگنے کی کیا ضرورت؟

ان کی آنکھوں میں اب نیند نے ڈیرہ جما لیا تھا اور وہ سونے کے لیے تیز تیز قدم اٹھاتے، دھول

مٹی سے اٹے راستوں کو روندتے ہوئے اپنے اندھیرے کمروں کی طرف واپس لوٹ گئے اور اندر داخل ہو کر ہتھیاروں کو آباؤاجداد کی قبروں کی طرح سجایا اور اپنی سوتی ہوئی بیویوں کے پہلو میں جا لیٹے اور سو گئے۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ اچانک ــــــ

ندی کنارے کیچڑ میں لت پت بکریوں میں اور گھاس چرتی بھیڑوں میں شور بلند ہوا۔ ایک ہلچل مچ گئی۔ شیر کی خونخواریت نے انھیں بے چین کر دیا۔ خوف سے وہ چلانے لگیں ان میں سراسیمگی پھیل گئی مگر گڈریا گاؤں کے اندھیرے کمروں میں سوتے ہوئے لوگوں کی طرح نہیں سو رہا تھا وہ تو جاگ رہا تھا۔ وہ بڑا ہی چالاک تھا اور عقل مند بھی۔ وہ شیر کی ہر چال سے واقف تھا۔

گڈریے نے دیکھا کہ جنگل سے شیر نکلا۔ اس نے بندوق سیدھی کی، نشانہ لیا اور لبلبی پر انگلی رکھ دی۔ شیر بھیڑ بکریوں کو نقصان پہنچائے بغیر گاؤں میں داخل ہو چکا تھا۔

گڈریا سوچنے لگا ــــــ فائر کرے یا نہ کرے؟

کافی غور و خوص کے بعد گڈریے نے اپنی بندوق نیچے کر لی ــــــ پتہ نہیں کیوں؟ اس نے فائر کیوں نہیں کیا۔ یہ کوئی نہیں جانتا ــــــ شاید گڈریا ہی جانتا ہو۔ جو آج بھی کندھے سے دونالی بندوق لٹکائے درخت کے نیچے بڑے اطمینان سے سگریٹ پی رہا ہے۔

○○
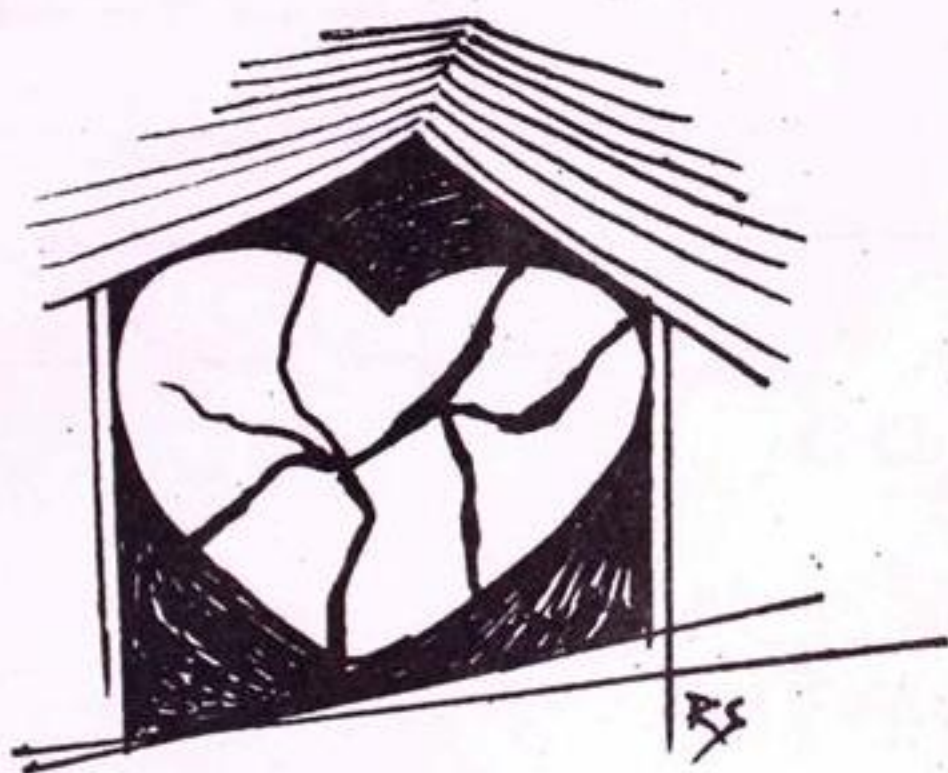
کھولی

اُسے اس بات کا قطعی علم نہ تھا کہ وہ اس فٹ پاتھ پر کہاں سے آیا تھا؟ اس سے قبل وہ کہاں رہتا تھا؟ آسمان نے اسے نیچے پھینکا تھا یا زمین نے اسے جنم دیا تھا؟

وہ کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔

وہ تو بس اتنا جانتا تھا آنکھ کھلی شعور کی اور اس نے ہوش سنبھالا تو فٹ پاتھ ہی اس کا گھر تھا۔ بغیر کھڑکی دروازے والا گھر۔

نیلا آسمان اس کی چھت اور زمین اس کا بستر۔

جب سارا شہر تاریکی میں ڈوب جاتا تو وہ نیلے آسمان کو جی بھر کر دیکھتا اور دور بہت دور آسمان کی وسعتوں میں کہیں کھو جاتا جیسے کوئی حسین خواب بن رہا ہو۔

اس کی دیرینہ خواہش تو یہی تھی کہ وہ فٹ پاتھ سے اٹھ کر کسی پاش علاقے میں رہائش پذیر ہو جائے اور فٹ پاتھ کی ذلت سے نجات پالے۔ اسی لیے آج اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ

جب سورج مشرق کی کوکھ سے جنم لے گا اور ساری بستی کو اپنی شعاعوں سے نہلا دے گا تو وہ فٹ پاتھ کے بستر کو لپیٹ کر سب سے پہلے کریم بھائی ہوٹل والا سے مل کر کھولی (کمرہ) کا انتظام کرے گا۔

سر چھپانے کے لیے ایک کھولی کا ہونا ضروری ہے۔
کسی پچھے علاقے میں چھوٹا سا کمرہ لے کر وہ اپنی بے قاعدہ زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرے گا۔

فٹ پاتھ پر رہتے ہوئے بارش کے دنوں میں تکلیف کا احساس دگنا ہو جاتا اور سردیوں میں صرف پانڈو حوالدار کی سکڑی جیب میں گرم سا ایک نوٹ ڈالنا پڑتا تھا۔ پھر ساری رات ہماری اور فٹ پاتھ بھی۔

اس کے بعد داؤد بھائی باٹلی والا کو فٹ پاتھ پر رہنے کا کرایہ یا ٹیکس ادا کرنا پڑتا۔
جیسے یہ سارا فٹ پاتھ ان کی جاگیر ہو لیکن ادھر کچھ دنوں سے میونسپل ملازمین نے فٹ پاتھ سے جھونپڑوں کو ہٹانے کا کام شروع کیا ہے۔ تب سے تو اور زیادہ پریشانی ہونے لگی ہے۔

وہ سوچتا ---- جب کرایہ ہی دینا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ کسی کھولی کا انتظام کیا جائے اور شان سے رہا جائے۔ جب سے گاؤں اور دوسرے علاقوں یا ریاستوں کے لوگوں کی آمد پر پابندی لگانے کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ نئے آنے والے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل رہا ہے۔ تب سے اسے کمرے کا انتظام آسان محسوس ہونے لگا تھا۔
جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کی چادر اس کے پورے جسم پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور زندگیوں کو دوڑتا' بھاگتا دیکھنے لگا۔
موٹر گاڑیاں' ٹیکسیاں' لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر' بس اسٹاپ پر کھڑے بے چین مسافر' دور تک پھیلی ہوئی سیاہ سڑک ہوٹلیں اور فٹ پاتھ
یہ منظر دیکھ کر اس میں جینے کی تمنا جاگ اٹھی او وہ بسم اللہ ہوٹل میں داخل ہوگیا۔

چائے ناشتے کے بعد عادتاً اخبار پر سرسری نظر دوڑائی اور ڈیوٹی کے لیے نکل پڑا۔

شام جب رات کی کوکھ میں اتر جاتی تو وہ تاریکی اوڑھ کر فٹ پاتھ کے بستر پر لیٹے لیٹے سوچنے لگتا کہ کل تک وہ ضرور کھولی تلاش کر لے گا۔ آخر کب تک وہ جانوروں کی طرح زندگی گزارے گا۔ پولس کا ڈر، داؤد باٹلی والا کا خوف، فٹ پاتھ پر بسنے والے لوگوں سے گھبراہٹ اور میونسپل ملازمین کی توڑ پھوڑ۔

ان سب سے اکتا گیا تھا وہ ــــ

ان دنوں وہ اچھا خاصا کما لیتا تھا اور خاصی رقم کریم بھائی کے پاس جمع کر دیتا تھا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اسے کسی کی فکر بھی نہ تھی۔

مگر کچھ دنوں سے فٹ پاتھ ہی پر رہنے والی ایک لڑکی رانی نے اس کے دل کے دروازے پر ہلکے سے دستک دی تھی تب سے وہ اپنے آگے پیچھے کسی کو محسوس کرنے لگا تھا۔ رانی اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ وہ دن بھر فٹ پاتھ پر بنے ٹاٹ کے جھونپڑے میں بیٹھی بیڑی بناتی۔ اس کا باپ کسی بار میں نوکری کرتا تھا۔ اور ماں لوگوں کے گھر جاکر کام کرتی تھی۔

رانی نے جب سے اس کے اندر پیار اور گھر کا تصور ابھارا تھا تب سے وہ رانی اور گھر کو یکساں طور پر چاہنے لگا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر رانی کی تصویر چسپاں ہو گئی تھی۔ رانی سے اس کے خواب جڑے ہوئے تھے۔ بیوی بچے تعلیم، ان کی پرورش سبھی کچھ۔ رانی دھیرے دھیرے اس کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئی تھی۔

پھر کریم بھائی ہوٹل والا کا مخلص اور معصوم چہرہ ابھرتا تو وہ ان کے بارے میں سوچنے لگتا۔

کتنے بے غرض اور ہمدرد آدمی ہیں۔ اس لے کمرے کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ آج نہیں تو کل ضرور وہ کھولی کا انتظام کر دیں گے۔ وہ تو کلپنا ٹاکیز کے سامنے جھونپڑپٹی میں کھولی کرائے پر لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر اسے کریم بھائی نے ہی منع کیا تھا۔ اور سمجھایا تھا کہ

یہ جگہ تمہارے لائق نہیں۔ دوسرے ہی دن اس جھونپڑپٹی پر بلڈوزر چلادیا گیا تھا۔

کریم بھائی بڑے ہی دیانت دار اور ایماندار آدمی تھے۔ ان کی دور اندیشی بھی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کہتے اور کرتے وہ ان کے تجربات کا نچوڑ ہوتا اس نے کریم بھائی کے پاس ڈپازٹ کے روپئے بھی جمع کردیئے تھے۔ اسے ان پر پورا بھروسہ تھا۔ ان کی ایمانداری اور سنجیدگی سارے محلے میں مشہور تھی۔ فٹ پاتھ پر بسنے والے لوگ تو انھیں اپنا ضامن سمجھتے تھے۔ وہ لوگ ان کے پاس ہی اپنی ساری پونجی جمع کرتے تھے۔ اور وہ بھی کبھی حساب میں ایک پیسے کا فرق نہیں آنے دیتے۔

رات کی تاریکی میں وہ نیلے آسمان کو دیکھنے لگتا۔ جہاں ستارے آنکھ مچولی کھیلتے اور چاند بادلوں میں کہیں چھپ جاتا۔

کریم بھائی پولس' چور' داؤد باٹلی والا' رانی' چھت' آسمان زمین' بستر سب کچھ اس کے ذہن میں گڈمڈ ہوجاتے کبھی وہ کھولی کے بارے میں سوچتا یا پھر ان لوگوں کے بارے میں جو فٹ پاتھ پر بغیر کسی امتیاز کے مل جل کر رہتے تھے۔ اور آپس میں کبھی نہیں ٹکراتے تھے۔ اس کی نظریں پھر رانی پر جاکر رک جاتیں۔

رانی جس نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا تھا۔ اسے گھر کا تصور دیا تھا۔ وہ اسی سے شادی کرے گا۔ اس کے بچے بھی ہوں گے۔ لیکن وہ زیادہ بچے پیدا نہیں کرے گا۔ کیونکہ مہنگائی کے زمانے میں کم بچے پیدا کرکے سکھی پریوار کی بنیاد رکھنا عقل مندی ہے۔ شادی کے بعد وہ رانی کا پورا پورا خیال رکھے گا۔ نہ پولس کی دھمکی ہوگی اور نہ دھاندلی' بس وہ ایک ہی مقصد کے تحت زندگی گزارے گا۔ بے مقصد اور بے سبب زندگی کو وہ رانی کی خاطر اس فٹ پاتھ پر ہی کہیں دفن کردے گا۔ کل سے وہ کھولی میں ضرور رہے گا۔ اس کی زندگی میں ڈسپلین آجائے گا۔ وہ شادی رچاکر رانی کی زندگی کو سنوارے گا۔ نکھارے گا۔ ایک باعزت شہری کی طرح ۔۔۔

یہ سوچتے سوچتے وہ کب نیند کی آغوش میں چلا گیا کچھ پتہ نہ چلا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو فٹ پاتھ جاگ گیا تھا' راستے کا سناٹا شور میں تبدیل ہوگیا تھا۔ کیونکہ سورج نے رات کا سارا منظر جلا کر راکھ کردیا تھا۔ اور اب اسے منہ چڑا رہا تھا۔

اس کے قدم خود بخود بسم اللہ ہوٹل کے طرف چل پڑے۔ کریم بھائی اسی کا انتظار کررہے تھے۔ جہانگیر کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی وہ خوشی خوشی کہنے لگے۔

''جہانگیر تمہاری کھولی کا انتظام ہوگیا ہے۔''

''کیا؟ --- جہانگیر نے متعجب ہوکر دریافت کیا۔ -----''

''ہاں ---سچ مچ کھولی کا انتظام ہوگیا ہے۔''

جہانگیر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کی دھڑکن رک جائے گی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا واقعی --- میں کھولی میں رہوں گا۔ فٹ پاتھ میرے لیے ایک بیتا ہوا کل ہوگا۔

ہاں۔ -- جہانگیر --- چلو کھولی دیکھ لو --- اندرا نگر میں ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جسے برسوں پہلے برباد کردیا گیا تھا۔ بلڈوزر چلاکر۔ غریبوں کے سروں سے چھت چھین لی گئی تھی۔ مگر بعد میں اسے اندرا گاندھی نے بسایا تھا۔ تب سے یہ علاقہ اندرا گاندھی کے نام سے منسوب ہے۔ چلو ---''

دونوں تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے اندرا نگر کی طرف چل پڑے۔

کریم بھائی نے دوڑتے ہوئے روڈ کراس کرلیا تھا۔ یہ نیشنل ہائی وے تھا۔ جو بہت زیادہ مصروف رہتا تھا اور گاڑیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سگنل بھی بہت دور تھا۔

جہانگیر روڈ کراس نہیں کرپایا تھا وہ رانی اور کھولی کے متعلق سوچتے ہوئے کہیں دور نکل گیا تھا۔ منصوبوں کی دنیا میں ابھی وہ روڈ کراس کرنے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک ایک تیز رفتا وین نے اسے بڑی بےدردی سے کچل دیا۔ جبکہ وہ سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ --

فضا میں ایک چیخ ابھری اور غائب ہوگئی۔ لوگوں کا شور بلند ہوا ---

"پکڑو ۔۔۔ دوڑو۔۔۔"

"اس گاڑی کا نمبر نوٹ کرو۔۔۔ دوڑو۔۔۔"

پھر سرگوشیاں۔۔۔

"ارے جانے دو۔ پولس کی وین ہے۔۔۔ پولس۔۔۔ ہاں۔۔۔ شاید ڈرائیور شراب پی کر گاڑی چلا رہا تھا۔۔۔ لوگ جہانگیر کی لاش کے قریب اکٹھا ہوئے اور بکھر گئے۔

جہانگیر وہیں تڑپتا رہ گیا۔

کریم بھائی دوڑے مگر وہ تو اس جہاں سے کہیں دور چلا گیا تھا۔ اس کے سارے سپنے پولس وین نے چکنا چور کر دیئے تھے۔ کریم بھائی کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے وہ رونے لگے۔ جیسے ان کا اپنا کوئی عزیز مرگیا ہو۔ وہ جانتے تھے کہ اس فٹ پاتھ پر بسنے والے غلیظ قسم کے لوگوں سے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا بس ایک گاہک اور دکاندار کا رشتہ تھا۔ یہ لوگ بسم اللہ ہوٹل میں چائے پیتے کھانا کھاتے اور فرصت کے اوقات اسی ہوٹل میں گپ شپ کرتے رہتے۔ مگر کریم بھائی ہوٹل مالک کے ساتھ ایک دردمند دل رکھنے والے آدمی بھی تھے جو ان غریبوں کے دکھ درد میں کام آتے تھے۔ ایک بار تو میونسپل ملازمین ان جھونپڑوں پر ٹوٹ پڑے تھے مگر کریم بھائی نے بیچ بچاؤ کر کے اس توڑ پھوڑ کو رکوا دیا تھا۔ کریم بھائی سیاسی اثر و رسوخ بھی رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ فٹ پاتھ کے لوگوں کے لیے مسیحا بن گئے تھے۔

کریم بھائی جہانگیر کی لاش کو اٹھا کر وہ بسم اللہ ہوٹل کی طرف چل پڑے۔

لوگ جمع ہوگئے اور زار و قطار رونے لگے۔ رانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کے چشمے خشک ہوگئے تھے۔ وہ صرف جہانگیر کی لاش کو مسلسل گھور رہی تھی۔

کریم بھائی سوچنے لگے۔ جہانگیر پہلا شخص تھا جس نے فٹ پاتھ پر رہ کر بہتر زندگی کا خواب دیکھا تھا۔ اس خواب کی تعبیر بھی پا چکا تھا۔ مگر تقدیر نے اسے ایسا گرایا کہ پھر وہ اٹھ نہ سکا۔

جہانگیر کے جمع کئے ہوئے ڈپازٹ کے روپیوں سے کریم بھائی نے اس کی تجہیز و تکفین کی۔ جب اسے قبر میں اتارا گیا تو کریم بھائی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے روتے روتے کہنے لگے جہانگیر کی دیرینہ خواہش آج پوری ہو گئی۔ - - !!

●●

بابو جی

بابا جی کو ہم نے بابو جی میں تبدیل کر دیا تھا اور اب وہی بابو جی نہ رہے تھے جو ہمارے پتا تھے۔ ان کا دیہانت برسوں پہلے ہوا تھا۔ مگر ان کی یادیں اور باتیں، قہقہے اور چڑچڑاہٹ۔ سبھی کچھ تھا ہمارے پاس۔ ان کا غصہ اور جھلاہٹ ۔یہی پونجی تھی سرمایہ تھا بابو جی کا۔ وقت کی سوئیاں بڑی تیزی سے گھوم گئی تھیں اور سب کچھ بکھر چکا تھا پھر بھی ایسا لگتا تھا جیسے بابو جی ہم سے ابھی جدا ہوئے ہوں ان کی یادیں زندگی کی پگڈنڈیوں پر، اوبڑ کھابڑ راستوں پر ہماری رہنمائی کرتیں ہم اس کے سہارے گرتے سنبھلتے دور تک نکل جاتے کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے بابو جی اب بھی ہمارے درمیان موجود ہوں کہیں نہ کہیں آرام دہ کرسی پر بچوں کے ساتھ کھیلتے یا پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھے اخبار کی خبروں میں گم——— یا اپنے آپ کو تلاش کرتے ہوئے۔ شاید ان کی موجودگی کا احساس ہمارے اندر سرایت کرگیا تھا۔ اب ان کی حیثیت کسی داستانوی کردار کی طرح ہو کر رہ گئی تھی۔

''بابا کوئی کہانی سنائیے نا۔۔۔۔۔
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ ''ارے پگلے اتنا بڑا ہوگیا ہے اب مجھ سے کہانی سنے گا۔''
''ہاں سنوں گا۔'' میں ضد کرنے لگتا۔
اور بابا کہانی شروع کردیتے۔ ایک سماں بندھ جاتا۔
مگر وہ بہت دنوں تک بابا نہیں رہے' بابوجی بن گئے۔ ماتا جی دن بھر ان کے واقعات پر مبنی کہانیاں سناتیں ان کے پیار' نفرت' اخلاق و عادات سے بچوں کو روشناس کراتیں۔ بچے بابو جی کے واقعات کو یوں سنتے جیسے پنچ تنتر کی کہانیاں سن رہے ہوں۔ ماتا جی کہانیوں کو دل چسپ اور موثر انداز میں پیش کرکے پراسرایت کا ماحول بنادیتیں۔ بچے کہانیوں کے ذریعے بابو جی کے قریب ہوتے جاتے انہیں کوئی ہیرو سمجھنے لگتے۔ لیکن جب بچے اسکول چلے جاتے تو پھر ماتا جی کو تنہائی ڈسنے لگتی اور وہ کسی پاگل کی طرح سارے گھر میں بابو جی کو تلاشتی ڈرائنگ روم سے لے کر گیلری تک۔ جب کہیں نہیں ملتے تو ماتاجی صوفے پر دراز ہوکر داستانوی دھند میں گم ہوجاتیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے ایسے رواں ہوتے جیسے وہاں کوئی چشمہ ہو' بابوجی کے بغیر تو وہ نامکمل تھیں' ایک دم ادھوری!
گیلری میں پڑی آرام کرسی پر بابوجی اخبار کی سرخیوں میں گم ہوجاتے۔ آج بھی وہ آرام کرسی ویسے ہی پڑی ہے اور اخبار تپائی پر بکھرے بکھرے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ کسی اخباری سرخی میں ڈوب جاتے اخباروں اور کتابوں کا مطالعہ ان کی عادت تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا اخباروں اور کتابوں کی دلچسپ اور معنی خیز دنیا میں باقاعدہ طور پر داخل ہوگئے تھے۔ وہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ بس مڈل پاس۔

بابوجی اکثر کہا کرتے تھے کہ مطالعے کی عادت صحت مندی کی نشانی ہے۔ اسی لیے بابوجی زندگی میں کبھی کسی قسم کی سیاسی' سماجی بیماری اور فرقہ واریت میں مبتلا نہیں رہے۔ ان کے ساتھی آخری ایام میں مذہبی جنون کا شکار ہوگئے تھے۔ مگر بابوجی پر اس طرح کا کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ وہ اس نشے سے ہمیشہ دور رہے۔

آفس سے لوٹتے ہوئے میں باوجی کے لیے شام کے اخبارات سندھیا کال' مہانگر' ہندڈے ضرور لے آتا۔ ساتھ ہی ان کی تمباکو بھی۔ وہ انگریزی اچھی جانتے تھے۔ گھر کے حالات اور مسائل نے انہیں اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھا اور پھر گاؤں میں کوئی ہائی اسکول یا کالج بھی نہ تھا۔ صرف مڈل تک تعلیم کا انتظام تھا اور مڈل کے بعد تعلیم کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا اسی لیے گاؤں کے رئیس اور جاگیرداروں کے بچے ہی شہر کی طرف تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ باوجی مڈل پاس کرنے بعد زندگی کے ڈرامے میں اپنا رول نبھانے لگے تھے——اگھر پہنچنے پر سب سے پہلے باوجی کے سامنے پیشی ہوتی۔ وہ کسی وکیل کی طرح ہم سے مختلف سوالات کرتے۔ تاخیر کی وجہ پوچھتے۔ اگر وجہ معقول نہ ہوئی تو ان کے غصے کا سامنا کرنا پڑتا۔ بس لیٹ تھی یا لوکل' یا جان بوجھ کر لیٹ تو نہیں ہوئے۔ کہیں دوستوں کے ساتھ گپ شپ تو نہیں کر رہے تھے۔ اس طرح کے سوالوں کے جواب اخذ کرنے کے بعد وہ پھر اپنے خاص موضوع پر آجاتے۔ یعنی اخبارات اور تمباکو۔

باوجی نے اپنی زندگی کے قیمتی چالیس برس بمبئی شہر کی نذر کیے تھے۔ اس فیشن زدہ اور خود غرضی کے جنگل میں وہ مخلص' ہمدرد اور سیدھے سادے انسان کی طرح داخل ہوئے تھے۔ مزاحمتوں' صعوبتوں کا مقابلہ کرتے رہنا ہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ وہ جس حالت میں شہر میں داخل ہوئے تھے اسی وضع میں یہاں سے لوٹ گئے۔ آخر تک وہ ہتھیلی پر تمباکو رکھ کر چونا رگڑتے اور پھر تمباکو ہونٹوں تلے دبا لیتے۔ یہی ان کی تہذیب تھی۔ بمبئی میں انہوں نے دو ہی چیزیں تو کھائی تھیں۔ اخبارات اور تمباکو!

باوجی نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام اچھے ڈھنگ سے کیا تھا۔ ہم دو بھائی اور تین بہنوں کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم ایک دلت اور میونسپل ہاسپٹل کے وارڈ بوائے کی اولادیں ہیں۔ ہمارے پتا سماج کے ایک معمولی اور نفرت و حقارت سے دیکھے جانے والے شخص ہیں۔ باوجی اکثر کہا کرتے تھے کہ اب اس جنونی دنیا میں ان کا کیا ہے۔ وہ رہیں یا نہ رہیں۔ بس ان کے دونوں بیٹوں کو اچھی سی ملازمت مل جائے۔ وہ کھانے کمانے

اور پیروں پر کھڑے ہو کر چلنے لگیں۔ انہیں زندگی گزارنے کے لیے بیساکھیوں کی ضرورت نہ پڑے اور جان سے پیاری بیٹیوں آشا، لتا اور اوشا کا بیاہ برسرِ روزگار لڑکوں سے رچا کر سکھ اور چین کی نیند سو جائیں۔ بس یہی تو خواب تھا ان کا جو وہ اکثر دن میں ہی دیکھا کرتے تھے۔ کھلی آنکھوں ایک خواب! اسی لیے تو انہوں نے ساری زندگی مریضوں کی گندگی صاف کی۔ خود گندگی میں اترے مگر اپنے بچوں کو ہاسپٹل سے دور رکھا۔ اس کے ماحول سے دور رکھا اس کی گندگی کے چھینٹے بھی ہمارے جسم پر پڑنے نہیں دیے۔ انہوں نے ہم بھائی بہنوں کو اچھے اسکولوں میں تعلیم دلوائی اور اس قابل بنایا کہ ہم زندگی کی دوڑ میں شامل ہو سکیں۔ کبھی انہوں نے ہم پر دھوپ نہیں آنے دی۔ بلکہ ہمارے حصے کی تمام دھوپ بھی خود ہی جھیلتے رہے۔ کبھی کسی کو تکلیف کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ ہمیشہ سایہ بنے۔ ہماری سبھی خواہشات کا احترام کیا۔ بیٹیوں کے بیاہ کے لیے مناسب جہیز جمع کیا اور انہیں زندگی کا سبھی سکھ دیا۔

اپنی زندگی کے پورے تیس سال انہوں نے میونسپل ہاسپٹل کے حوالے کئے انچارج کی جھڑکیاں سنیں۔ سسٹرس کی گالیاں سہیں۔ ان کو تمباکو کی تھّی کی طرح ہونٹوں تلے دبا کر آہستہ آہستہ حلق سے اتارا اور برسوں تک ہضم کرتے رہے۔ انا جو انہیں سرکشی کی دعوت دیتی تھی۔ اس کا خون کیا۔ مریضوں کی گالیاں سنیں اور ان کے دکھ درد میں شریک بھی رہے۔

رٹائر منٹ کے بعد وہ گھر کی چاردیواری میں مقید ہو کر رہ گئے تھے۔ باہر کی دنیا تو جیسے انہوں نے تیاگ دی تھی۔ باہر جیسے کرفیو لگا ہو۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتے کہ کالونی سے باہر نہ جائیں۔ پہلے پہل وہ ایوننگ واک کے لیے نکلتے تھے۔ اور اپنے ریٹائرڈ دوستوں کے ساتھ امبیڈکر گارڈن تک جاتے تھے۔ گارڈن میں بیٹھ کر خوب باتیں ہوتیں۔ بحثیں ہوتیں کبھی نوبت توتو میں میں تک پہنچ جاتی۔ وہاں کا تھوڑا بہت تناؤ وہ گھر پر بھی لاتے۔ مگر جب لتا کی شادی کے لیے دولہے والوں کی طرف سے مطالبات کی لمبی فہرست پیش ہوئی نقد رقم کا مطالبہ ہوا۔ اور مطالبات پورے نہ ہونے کی بنا، پر رشتہ توڑ دیا گیا تو بس، اسی بات نے بابو جی کے دل پر گہرا اثر کیا اور وہ دل کے مریض بن گئے۔ تب سے وہ اور زیادہ مایوسی اور افسردگی کا شکار

ہوگئے تھے۔ وہ اندر سے ٹوٹ گئے تھے۔ اب انہیں کچھ بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ نہ باہر کی دنیا نہ گھر کا ماحول۔ بس دن بھر اخبارات میں سرکھپائے خبروں کے بہانے روتے رہتے تھے۔ کیوں کہ ان کے اپنے بچوں نے انہیں آخری وقت میں مطمئن نہیں کیا تھا۔ وہ یہی سب سوچتے تھے۔ ان کی اپنی اولادیں، گھر کے دیگر افراد کم از کم انہیں دلت نہ سمجھیں۔ کوئی وارڈ بوائے نہ سمجھیں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ سماج میں انہیں جو سمجھا گیا دراصل اسی حیثیت سے وہ گھر میں موجود رہے۔

مجھے اس طرح بابوجی کا کھوئے کھوئے رہنا، تنہائیوں کے اندھیروں میں گم ہوکر آنسو بہانا بالکل پسند نہ تھا۔ اس لیے روز بلا ناغہ ان کی غذا ضرور لاتا۔ جس دن ان کی غذا یعنی اخبار اور تمباکو بھول جاتا ان سے کافی سخت سست سننا پڑتا۔

سرد جنگ تو ہمارے گھر میں برسوں سے چلی آرہی تھی۔ بابوجی کی کسی بھی بات کو سنجیدگی سے نہیں سنا جاتا تھا۔ ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی جاتی تھی۔ ہر کوئی اپنے مورچے پر ڈٹا رہتا۔ بابوجی ایک طرف تھے تو سارا گھر دوسری طرف! نہ بہنوں کے پاس اتنا وقت تھا اور نہ چھوٹے بھائی کے پاس۔ مگر میں کسی نہ کسی بہانے ان سے ضرور بولتا۔ انہوں نے آج تک مجھ سے کسی چیز کی فرمائش نہ کی تھی۔ اور نہ ہی مجھے کبھی یہ احساس ہونے دیا کہ ہم پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

بابوجی کو گھر کے تمام افراد سے چڑ سی ہوگئی تھی۔ برسوں سے ایک جگہ اور ایک جیسے چہروں کے درمیان رہتے ہوئے وہ شاید اوب گئے تھے اور اب کسی نئی جگہ کی تلاش میں تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کیا بڑھاپا اس قدر ذلیل بھی کرتا ہے؟ آخری ایام میں اتنی رسوائی بھی ہوتی ہے؟ آخر کیوں؟ مگر اس کا جواب میرے بس کی بات نہیں ہے۔

بابوجی کی وجہ سے گھر میں کوئی نہ کوئی ٹینشن، کوئی نیا پرابلم جنم لیتا۔ کبھی کسی معمولی اور غیر اہم بات پر ماتا جی سے الجھ جاتے تو کبھی اپنی بہوؤں سے۔ کبھی بیٹیاں ان کے بڑھاپے کو کوستیں تو کبھی بچوں کی کسی شرارت سے وہ سارے گھر کو سر پر اٹھا لیتے یا ان کے ساتھ مل

کر خود بھی بچوں کی سی شرارت کرنے لگتے تھے۔ غرض کہ بابوجی ریٹائرمنٹ کے بعد سے ہمارے لیے ایک مسئلہ بن گئے تھے۔ ان کی اپنی اولادیں ہی ان کو اس گھر سے نکالنے کی سوچنے لگی تھیں۔ ان کے ریٹائرمنٹ سے قبل ہی ہم دونوں بھائی سروس جوائن کر چکے تھے اور ٹھیک سے کمانے لگے تھے۔ اب گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہمارے کندھوں پر تھا۔ ساری فکریں اور پریشانیاں اب ہمارے حصے میں آگئی تھیں۔

آنکھوں پر موٹے فریم کی عینک' دھوتی بنڈی پہنے' دن بھر کی خبروں میں اپنے آپ کو دکھ لیتے۔ وہ گاؤں کی کسی چوپال میں بیٹھے آدمی کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ بچے ان کے آس پاس جمع ہوجاتے اور کہانیاں سنتے۔ وہ روایت کے پاسدار تھے اور اپنی دیہاتی تہذیب کو بھول نہ پائے تھے۔ گاؤں کی باتیں بچوں کو سناتے' بچے بڑے غور سے سنتے۔

فکر اور گھٹن نے انہیں ایکدم لاغر اور کھوکھلا کردیا تھا اور اپنے ہی گھر میں اجنبی بن جانے کے خوف نے ان کے چہرے پر جھریوں کا جال بچھادیا تھا۔ وہ اکثر سوچ کی انگلی تھامے ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے تھے۔ کرسی میں دراز وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے۔ شاید زندگی کے جھمیلوں کا حساب لگاتے۔ بھی وہ جب کسی کام کو انجام دینے گھر سے نکلتے تو بڑے اہتمام سے جاتے۔ پرانے جوتے پر پالش کرواتے۔ بغل میں چھتری' سر پر گاندھی ٹوپی جمائے' جاکٹ پہنے سر جھکائے۔

بابوجی سے گھر میں بھی ذلتوں کا سا سلوک کیا جاتا۔ تینوں بہنوں کو وہ ایک نظر نہیں بھاتے تھے۔ بابوجی اور چھوٹے بھائی بھیم راؤ کے ستارے کبھی نہیں ملے۔ ستارے تو میرے بھی نہیں ملے۔ مگر پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا جیسے شاید ہم کچھ نہ کچھ غلط کر رہے ہیں۔ ان کی بہت سی عادتوں اور حرکتوں کو عام طور پر ناپسند کیا جاتا۔ سبھی کو یہ شکایت تھی کہ انہوں نے اتنے برسوں میں کچھ نہ کیا ------- نہ اچھا گھر ہی وہ بنا سکے۔ نہ ان کے لیے کوئی اچھی سے ملازمت ہی تلاش کر پائے۔ بس وہی کلرکی! دونوں بہوؤں سے ان کی خوب جمتی تھی۔

مگر وہ بھی ان کے بڑھاپے کے متعلق کچھ نہ کچھ ریمارکس ضرور پاس کرتیں۔ ان سے الجھنے اور حجت کرنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ ان سے مڈبھیڑ کبھی بھی ہو جاتی تھی۔ ایک ماتا جی ہی تھیں جو ان کی ہر بات پر لبیک کہتیں، ان کے غصے کو، چڑچڑاہٹ کو چپ چاپ سہ جاتیں ان کا ہر طرح سے خیال رکھتیں ناشتہ، کھانا، اخبارات اور تمباکو۔ ان کا ہاتھ پر چونا رگڑ کر تمباکو کھانا اور ادھر ادھر تھوکنا کسی کو پسند نہ تھا۔ مگر سبھی برداشت بھی کرتے رہے۔ اور نفرت بھی۔ دراصل نفرت باؤجی سے نہیں تھی بلکہ ان کے اس بڑھاپے سے تھی جسے زندگی نے تلخ تجربات دئے تھے۔ ایک دلت اور وارڈ بوائے کی زندگی کے گھناؤنے تجربات۔

اور باؤجی عمر کی ایسی دہلیز پر کھڑے تھے جہاں شام ہوتے ہی سناٹا طاری ہو جاتا ہے اور زندگی کے اس کھنڈر میں الّو بولنے لگتے ہیں۔ ایک بھیانک قسم کی خاموشی تعاقب کرتی رہتی ہے وہ اس کھنڈر کو چھوڑ کر کبھی بھی غائب ہو سکتے تھے۔

اب چڑچڑاہٹ اور جھلاہٹ ان کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے میں زیادہ تر باؤجی سے دور ہی رہتا۔ مجھے بھی ان کے بڑھاپے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ مگر شام کو اخبارات لانے کی ڈیوٹی میری تھی۔ اور اس ذمہ داری کو میں بہ حسن و خوبی نبھا رہا تھا۔ اور اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی میرا اور ان کا سامنا ہو جاتا۔ ان کا جب جی چاہتا کتابوں کی فہرست میرے حوالے کر دیتے۔ صبح جو فہرست تھمائی تھی شام تک ساری کتابیں آجانی چاہئیں۔ نہیں تو ان کا بڑھاپا قہر بن کر نازل ہوتا۔ اور میں اس قہر سے خوب واقف تھا۔

اس کے علاوہ ان کا ایک رخ پیار، دلار، شفقت، محبت اور بچپن کا بھی تھا۔ چھوٹے بچے کی طرح وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے گھر کو کھیل کا میدان بنا لیا جاتا۔ بچے ان سے بہت خوش رہتے شروع میں وہ بچوں کو اسکول چھوڑنے بھی جاتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ باہر کے ماحول سے اکتاہٹ پیدا ہوتی چلی گئی۔ بچے انہیں پسند تھے، ہمارے بھی اور پڑوسیوں کے بھی! کبھی کبھی وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اچانک غائب ہو جاتے تلاشنے پر وہیں ملتے مگر ان کی شکل بدل جاتی۔ وہ بچہ بن جاتے تھے۔ اور کبھی بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے تھے۔ جیسے عموماً

پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ بچوں کی ضدیں پوری کرتے۔ اور ان سے خوش رہتے۔

اور جب میں بابوجی کے آدرشوں کی بات کرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے۔ اور جن باتوں پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کرتے تھے۔ اور جس انداز سے تربیت کرتے تھے وہ بالکل سچ تھیں اس وقت ہماری آنکھوں پر جہالت کی پٹی بندھی تھی۔ بابوجی نے علم کا چراغ ہمارے ہاتھوں میں دیا تھا مگر اس کی روشنی سے ہم ہی فیض یاب نہ ہو سکے۔

آج بابوجی اور میرے درمیان برسوں پر محیط ایک خلیج حائل ہے زندگی کے طوفان میں ہاتھ پیر مارنے کے بعد آج میں ایک ایسے کنارے پر کھڑا ہوں' جہاں مجھے بابوجی کی باتوں کا' ان کی چڑچڑاہٹ کا شدّت سے احساس ہو رہا ہے۔ ان کے قہقہے صاف سنائی دے رہے ہیں۔ اتنے برسوں میں کہیں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ کوئی تبدیلی نہیں' سب کچھ ویسا ہی تھا۔ پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں کچھ بدل گیا ہے۔ کہیں کچھ؟

اخبار کا مطالعہ میری عادت بن گئی ہے۔ اور بچوں کو سنبھالنا میری وراثت۔ میری بیوی چھوٹے بچوں کو بابوجی کی زندگی کے واقعات پر مبنی کہانیاں سناتی ہے۔ بچے محظوظ ہوتے ہیں۔

بابوجی کے دیہانت کے بعد ہی بھیم راؤ جمہور کالونی میں شفٹ ہوگیا تھا۔ اپنی فیملی کے ساتھ۔ اس نے زندگی کو اپنی عینک سے دیکھا تھا۔ وہ تو شادی کے فوراً بعد ہی علاحدہ ہو جانا چاہتا تھا مگر بابوجی کی ضد آڑے آگئی اور وہ نہ جا سکا۔ اس کے اور میرے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک آم تو دوسرا کریلا۔ مگر بابوجی اکثر کہا کرتے تھے۔ کہ مل جل کر رہو۔ اتحاد میں طاقت ہے۔ انہوں نے کبھی بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے پتا کی طرح لکڑیوں کا بنڈل توڑنے کے لیے نہیں کہا تھا مگر وہ ہم دونوں کے دلوں میں اتحاد کی جوت جگانے کے لیے اندر ہی اندر کڑھتے رہے تھے۔ اور ہم ان کے اندر کے اس دھوئیں کو بھی نہیں دیکھ پائے تھے۔ جس نے بابوجی کو کھوکھلا کر دیا تھا۔

خری دنوں میں فالج کا اثر ہوا اور پھر وہ بستر سے اٹھ نہیں سکے، بول نہیں سکے، چل پھر نہیں سکے۔ آرام کرسی پڑی رہی۔ گھر کے تمام افراد کوشش کرتے رہے کہ بابوجی آخری عالم میں ہمارے حق میں کوئی مناسب بات کہہ جائیں۔ ساری زندگی تو وہ کچھ نہ کچھ بولتے رہے ہدایتیں دیتے رہے مگر ان کی باتوں کو سننے کے لیے اس پر عمل کرنے کے لیے کسی کے پاس وقت بھی نہ تھا۔ اور آج جب وہ بول نہیں سکتے تو یہ امید کی جانے لگی کہ وہ کوئی نصیحت کرجائیں، کچھ تو دے جائیں مگر ان کی زبان تو بند ہوگئی تھی۔ کیوں کہ جو کچھ ان کو کہنا تھا وہ برسوں تک کہتے رہے تھے ہمارے ہی پاس ان کی باتیں سننے کے لیے وقت نہیں تھا۔ ہم نے وارڈ بوانئے کے اندر کے آدرش و یکتی کو سمجھا ہی نہیں، دیکھا ہی نہیں۔ اور اب یہ بھی پتہ چلا ہے کہ آدمی زندگی میں کتنی سطحوں پر جیتا ہے، اپنے اندر بھی، اپنے باہر بھی اور اپنے اطراف بھی!

اب حالات بڑی حد تک بدل گئے ہیں۔ بھیم راؤ چمبور میں ہے۔ اور تینوں بہنیں اپنی اپنی سسرال میں۔ مگر اتنے برسوں بعد بھی ایسا لگتا ہے کہ بابوجی اس گھر میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ لیکن کہاں؟ یہ سوال مجھے ہمیشہ کچوکے لگاتا رہتا ہے اور میں اس کا جواب برسوں سے تلاش کر رہا ہوں۔

"آپ کوئی کہانی کیوں نہیں سناتے۔" میری سوچ کے سلسلے کو گڈو نے توڑ دیا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے لگا جیسے کچھ نہیں بدلا ہے۔ میں نے گڈو کو دیکھا اور اسے گود میں بھر لیا اور اپنے آپ کو کہانی سنانے کے لیے تیار کرنے لگا۔ جب میں نے اپنے آپ کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ میں اسی آرام کرسی پر بیٹھا تھا جس پر بابوجی بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتے تھے۔

اور آج میں اپنے بیٹے اشوک کے دونوں چھوٹے لڑکوں گڈو اور ببلو کو گود میں لیے بیٹھا ہوں اور کہانی سنا رہا ہوں مجھے یہ احساس بھی ہو رہا ہے۔ کہ بابوجی سے اتنی نفرت کرنے کے باوجود وہ میرے اندر ہی سما گئے ہیں، سرایت کر گئے ہیں۔ میرے اندر———!
صرف میرے اندر!

○○

کشن پے

ان دنوں کچھ یوں ہوا کہ ''م'' کے سارے جسم پر خوف و ہراس کی چیچک نکل آئی ہے۔ اس کی آنکھوں تلے کینسر وارڈ کا سارا منظر چھایا ہوا ہے وہ آنکھیں کھولتا ہے۔ بند کرتا ہے۔ پلک جھپکتے ہی دروازے بند ہوتے ہیں۔ کھڑکیاں کھلتی ہیں۔ کھڑکیاں بند ہوتی ہیں۔ دروازے کھلتے ہیں اور پتہ نہیں کیا کیا بند ہوتا ہے اور کیا کیا کھلا ہوتا ہے۔ ''م'' اس خوف اور تشویش کے ماحول میں بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے۔ جب سورج کسی مہاجن کی طرح گھر گھر اپنی شعاعیں بانٹتا ہے تو ''م'' بھی ان شعاعوں کو لے کر آفس جانے کے لیے نکل پڑتا ہے۔ اس سڑک پر جس نے ایک بڑے علاقے کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور ایک ہی بستی کے یہ دو حصے ایسے ہیں جیسے ایک ماں کے دو جڑواں بیٹے سڑک جو کہ بہت لمبی ہے' اور سیاہ لباس میں ملبوس' وہ بہت دور تک اس ہائی وے کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ جس پر روزانہ حادثات ہوتے ہیں۔ اس سڑک کا تارکول جگہ جگہ سے اکھڑ چکا

ہے۔ اور گڑھے صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف وہی علاقے ہیں۔
جس کے ایک علاقے میں چیچک زدہ ''م'' رہتا ہے۔ سڑک کی بائیں اور دائیں طرف فلک
بوس عمارتیں ہیں۔ جو کھنڈر نما دکھائی دیتی ہیں۔ سنتے آئے ہیں کہ اب بھی عمارتوں میں
لوگ رہتے ہیں۔ جو کبھی دکھائی نہیں دیتے۔ صرف دن میں اور رات میں عمارتوں کی
بوسیدگی کو دیکھا گیا ہے۔ آدمی ان بلڈنگوں سے لاپتہ کیوں ہیں۔ کوئی نہیں جانتا۔ مگر ''م'' تو
صرف اتنا جانتا ہے کہ وہ معمولی کلرک ہے اور اس کے سارے جسم پر خوف و ہراس کی
چیچک نکل آئی ہے' چیچک تو ہر اس آدمی کو نکل آتی ہے جو جینا چاہتا ہے۔ اس کی تشویش
بڑھتی جا رہی ہے۔ تشویش کیوں بڑھ رہی ہے۔ یہ الگ معاملہ ہے۔

''م'' کا دماغ ماؤف ہوگیا ہے!!

سوچ کا پرندہ کچھ دیر اس کے دماغ کے پنجرے میں آکر ٹھہرتا ہے' چہچہاتا ہے اور
اسے ایک عجیب سی کش مکش میں مبتلا کر کے اڑ جاتا ہے۔ پرندہ برسوں سے اڑ رہا ہے۔
چیچک برسوں سے نکل رہی ہے۔ ''م'' برسوں سے اسی علاقے کا باشندہ ہے۔ محفوظ ہے
بھی اور نہیں بھی۔ شعاعیں جب آسمان کی بلندی سے نیچے پھیلتی ہیں تو وہ بھی شعاعوں کے
سہارے دور تک نکل جاتا ہے۔ اپنے گھر' اپنے افرادِ خانہ اور اپنے آپ کو بہت دور چھوڑ کر
وہ آفس جاتا ہے۔ آفس میں بھی وہ اکیلا ہی ہوتا ہے۔ اس پر خیالات یلغار کرتے ہیں۔ مگر وہ
بالکل تنہا ہوتا ہے۔ بھیڑ میں تنہا' اور اسے یہ احساس کسی دیمک کی طرح کھائے جا رہا ہے
کہ شاید وہ محفوظ نہیں ہے اور ان لوگوں کے درمیان جی رہا ہے جو بھیڑیے ہیں۔ جو پلک
جھپکتے ہی اس پر سفید چادر ڈال سکتے ہیں۔ اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اسپتال کا سارا
منظر گھوم جاتا ہے۔

جب ''م'' آفس میں کام کر رہا ہوتا ہے۔ تو اسے ایک ہی چیز بار بار اپنی طرف کھینچتی
ہے۔ بیوی' بچوں کی فکر اور جوان بیٹی کی چنتا اور سارے دھاگے جو کچے ہوتے ہیں۔ سارے

رشتے جو ٹوٹنے والے ہوتے ہیں۔ توڑ کر اس طرف کھینچا چلا جاتا ہے۔ گھر اگر اسے اطمینان ہوتا ہے۔ وہ خوش ہوتا ہے۔ بیوی کے پپڑی زدہ ہونٹوں پر مسکراہٹ، بچوں کی کلکاریاں اور جوان بیٹی کے جسم پر عزت و ناموس کا پیرہن اور ساری فکر چنتا ایک پل کے لیے بچوں کی ہنسی اور مسکراہٹ کے نیچے دب کر دم توڑ دیتی ہے۔

گھر کا منظر اب شانت ہے۔ کھڑکیاں کھلی اور دروازے بند ہیں۔ اس کی بیوی کا منہ بھی تو کھلا ہے۔ وہ کہتی ہے اب ہماری گڈی کا جسم بھر گیا ہے۔ اور اس کا قد تاڑ کی طرح ہوتا جا رہا ہے۔ اب وہ گڈی کہلانہ پسند نہیں کرتی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اب اس کے ہونٹ جو گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک ہیں اس پر لپ اسٹک جمنے لگی ہے۔ بالوں کی لٹ چہرے پر گرنے لگی ہے۔ اس کا سارا جسم کپڑے کے حصار کو توڑ کر باہر آنا چاہتا ہے۔ دوپٹہ بڑا ہی بے چین ہے۔ جو بار بار اس کے سینے سے پھسل جاتا ہے۔ گڈی اس دوپٹے کو پن لگاتی ہے۔ ہر بار پن ٹوٹ جاتی ہے۔ اور کیا ٹوٹتا ہے اس کے اندر کچھ علم نہیں۔ اب ہمیں اپنی آنکھوں میں خواب سجانا شروع کر دینا چاہیئے۔ مگر پلکوں پر تو گرد جمی ہے۔ اب گھر کے سبھی لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ گڈی بڑی خوبصورت ہے۔

''م'' جس علاقے میں رہتا ہے۔ وہ اس بستی کا بڑا ہی پاش علاقہ ہے۔ وہ اس کا اپنا علاقہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ وہ برسوں سے اس دھرتی پر رہتا ہے جو آج تک اسے قبول نہیں کر سکی ہے۔ اس لمبی سڑک نے ایک بستی کو دو چھوٹی بستیوں میں منقسم کر دیا ہے۔ اس علاقے میں جن لوگوں کے درمیان وہ رہائش پذیر ہے۔ بڑے بھیانک قسم کے ہیں۔ جن کے جسم سیاہ، بھدے چہرے اور بھنویں اوپر تک چڑھی ہوئی۔ نوکیلے دانت اور ان ہاتھوں میں مخصوص قسم کے ہتھیار جو بس ان ہی کے ہاتھوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ نہ کسی کے پاس دیکھے گئے نہ پائے گئے۔ وہ اتنے بھیانک چہرے والوں کے درمیان رہتا ہے اس نے اپنے آپ کو وہاں ایڈجسٹ کرلیا ہے۔

''م'' ہر بار یہ محسوس کرتا ہے کہ شاید وہ وہاں محفوظ نہیں ہے۔ پلک جھپکتے ہی

مخصوص ہتھیار فضا میں لہرائیں گے۔ ایک فلک شگاف نعرہ ابھرے گا۔ اور اس کی زندگی کی بس موت کی خلیج میں جا گرے گی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا ہے کہ آخر اس علاقے سے وہ کوچ کیوں نہیں کرتا ——؟ اس علاقے کی طرف جہاں وہ برسوں سے جانا چاہتا تھا۔ اور اس کی دیرینہ خواہش یہی ہے کہ وہ اس بستی والوں سے ملے۔ ان کے سکھ دکھ کو سکھ دکھ کی طرح برتے۔ اس کا جسم ایکدم لاغر ہے وہ اپنے ناتواں کندھوں پر اپنی زندہ لاش لیے وہاں تک کیسے پہنچے —— اس بستی کو چھوڑنے کا خیال سوال بن کر اس کی شریانوں میں دوڑتا اور جب باہر نکلتا تو اس پر خوف طاری کر دیتا۔ سوال کا ٹائم بم بھی ایک زمانے سے اس کے دماغ میں فٹ ہے۔ اس کے پھٹنے کے خوف نے اسے جان کنی کے عالم میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ ہر بار اس سوال کو قرنس وار کے حساب کی طرح حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ناکام رہتا ہے۔ وہ سوالوں کے ان کیڑوں کو جو دماغ میں کلبلاتے رہتے ہیں۔ مارنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

''م'' جانتا ہے کہ بھدے چہرے والے جب کبھی غصے سے بے قابو ہوتے ہیں تو ان کے سیاہ جسم سرخ رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور وہ دہشت پسندوں کی طرح مخصوص قسم کے ہتھیاروں سے شہر اور محلوں پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ جانور پرندے ان کا پہلا شکار ہوتے ہیں۔ بیچ بچاؤ کرنے جو لوگ آتے وہ بھی مارے جاتے ہیں اور ان معصوم پرندوں اور جانوروں کے ساتھ ساتھ وہ ان انسانوں کا شکار کرتے ہیں جو اس علاقے میں پہلے ہی خوف زدہ ہیں یا مظلوم۔ ''م'' سب کچھ جانتا ہے۔ مگر اس نے کبھی بیچ بچاؤ نہیں کیا۔ اس کے یہاں سے بھی کبوتر کی گردن مروڑ دی گئی تھی وہ کچھ نہ بولا۔ اسی لیے وہ محفوظ ہے۔

''م'' جب آفس میں تنہا ہوتا ہے تو سوچنے لگتا ہے کہ اسے اس بستی سے کوچ کرکے اس بستی میں چلا جانا چاہیئے۔ جو لمبی سڑک کے اس طرف ہے۔ جہاں پر نورانی چہرے اور سفید لباس میں ملبوس لوگ رہتے ہیں جو اس کے اپنے ہیں۔ اس کا جسم بھی تو نورانی ہے۔ برسوں سے وہ ان بدصورت اور بھدے چہروں کے درمیان زندگی کی گاڑی کو

بڑی آہستگی سے کھینچ رہا ہے۔ پھر بھی ہر وقت اسے نہ جانے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اسے اذیت اور خوف انجکشن دیا جا رہا ہے۔ اسے پتا ہے اور نہیں بھی ہے۔ زندگی کو موت کے آہنی پنجہ سے بچانے کی کشمکش میں وہ آج تک کوشاں ہے۔ کبھی کبھی اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے اپنے لوگوں کی یاد سے۔ یادیں اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر چھلک پڑتیں اور وہ زار و قطار رونے لگتا کاش وہ یہاں نہیں ہوتا۔ وہاں ہوتا۔

وہاں جہاں سفید لباس میں ملبوس اور نورانی چہرے والے لوگ بستے ہیں۔ جو کبھی پرندوں اور معصوم جانوروں کا شکار نہیں کرتے۔ اور نہ ہی بے گناہوں کو قتل کرتے ہیں۔ ان کے پاس مخصوص قسم کے ہتھیار بھی نہیں ہیں۔ اور نہ ہی وہ کبھی اچانک کسی بستی پر حملہ کرتے ہیں۔ بھدّے چہرے والے تو چاہتے تھے کہ ان کے علاقے میں جو تھوڑے سے انسان باقی رہ گئے ہیں انہیں خوف زدہ کر کے بھگایا جائے مگر وہ لوگ وہیں پر ڈٹے ہوئے تھے۔ وہ اس علاقے سے اپنی ماتر بھومی سے محبت کرتے تھے۔ ان ہی وفاداروں میں ''م'' بھی ہے جو ان خطرناک لوگوں کے درمیان اب زندہ ہے۔ اس کے زیادہ تر ساتھی اب تک شہید ہو چکے ہیں مگر اس پر تو خوف و ہراس کی چھپک نکل آئی ہے۔ ان لوگوں کے درمیان زندگی گزارنا بالکل ایسا ہے جیسا شیر کے پنجرے میں شیر کے ساتھ رہنا۔

''م'' کو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس کی بیٹی اب گڈی نہیں رہی کئی دنوں سے وہ اس بستی کو خیرباد کہنے کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہا ہے۔ پل پل کے ڈر اور لحہ لحہ کے خطرے سے اب وہ چوکنا ہو گیا ہے۔ اس کی زندگی کا چراغ مخصوص قسم کا ہتھیار کبھی بھی بجھا سکتا ہے۔ اور اس کی بیٹی کے جسم سے لباس کبھی بھی کھینچ لیا جا سکتا ہے۔ اس کے کان اس نعرے سے مانوس ہو گئے ہیں۔ وہ اب اپنا نعرہ بھولتا جا رہا ہے۔ وہ اکثر اس نعرے کو سنتا ہے اور اس کی گونج کو سارے ماحول پر خوف بن کر پھیلتے ہوئے دیکھتا ہے۔

اس نے ہتھیار دیکھے ـــــ بھیانک چہرے اور نوکیلے دانت۔ سیاہ جسم اور سیاہ لباس۔

جب وہ ان کے متعلق سوچتا تو خوفزدہ ہو جاتا۔ اس کا سارا جسم بے موسم برسات میں جیسے بھیگ جاتا۔ اسے اپنے سے زیادہ اپنی بیٹی گُڑی کی فکر ہے! جس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک جمنے لگی ہے۔ بالوں کی لٹ چہرے پر گرنے لگی ہے۔ اور جسم کپڑے سے باہر نکلنے کے لیے بے چین ہے۔

''م'' نے آج تک اس علاقے سے اس لیے بھی کوچ نہیں کیا کہ وہ اپنے قدم اس علاقے میں جما ہی نہیں چکا تھا بلکہ بہت اندر تک دھنسا چکا تھا۔ دھنسے ہوئے قدم نکالنے میں اسے بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ مگر تشویش کی چیچک نے اس کے جسم کے سبھی حصوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ خوف کے بادل اس کے دل کے آسمان پر چھا گئے اور تعجب و حیرت کی بارش کر کے گذر گئے۔

اس کی نظروں کے سامنے بار بار وہی منظر گھومنے لگتا۔

————— بھیانک اور بھدّے چہرے

————— نوکیلے دانت

————— مہلک ہتھیار

————— خون پیتے ہوئے جسم

————— دھواں دھواں فضا

————— کھڑکیاں دروازے بند

————— نعروں کی آوازیں

————— زخمی کبوتر —————؟

کافی سوچ بچار کے بعد ''م'' نے فیصلہ کیا کہ وہ اس علاقے کو چھوڑ دے گا اور یہاں سے کوچ کرے گا۔ اس طرف جہاں نورانی چہرے اور سفید لباس پہنے لوگ رہتے ہیں۔ اس کے اپنے لوگ' اس کا اپنا ماحول' اس کی اپنی تہذیب' اس کی اپنی زمین' جو کچھ ادھر ہے سب کچھ اسی کا ہے۔ وہاں جاکر اپنا آپ تلاش کرے گا جو اس نے یہاں کھو دیا۔ اسے

وہاں اپنی شناخت پر کوئی شرمندگی نہیں ہوگی۔ اب اس علاقے سے جو اس کے لیے ایک پنجرہ تھا، قید خانہ تھا چھٹکارا پالے گا۔

اور پھر ''م'' ایک دن کسی کو بتائے بغیر اپنے خاندان کے ساتھ نورانی چہرے والوں کی بستی میں منتقل ہوگیا ـــــــ اب اطمینان سارے جسم پر سرور بن کر پھیل گیا۔ اس نے زندگی کو موت کی خلیج سے گھسیٹ لیا تھا۔ اب کوئی خطرہ نہ تھا ـــــــ بیچ میں ایک لمبی سڑک حائل تھی، اس کھائی کی طرح جس میں سے واپس لوٹنا مشکل ہوتا ہے۔

اب تشویش کی چیخ بھی ریزگاری کی طرح غائب ہوگئی ہے۔

اس نے برسوں سے آسمان نہیں دیکھا تھا، کھلا آسمان، وہ سینہ تان کر کبھی نہیں چلا۔ اس علاقے میں وہ سینہ تان کر چل سکتا ہے اور آسمان کے گھونسلے میں مقید سورج کے پرندے کو اپنی آتشیں نظروں سے جلا سکتا ہے؟

پھر جانے کتنے دنوں بعد جب پردے اس نے کھڑکیوں سے ہٹائے اور سورج کو اندر آنے کی دعوت دی تو سورج کی شعاعوں نے اس پر یہ حقیقت عیاں کر دی۔ اس کے حواس گم ہوگئے۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس پر شیر چھوڑ دیا ہو۔ اور شیر اس کے جسم کے ہر علاقے میں تباہی مچا رہا ہے ـــــــ اس تباہی میں اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی بیٹی گڈی کا جسم کپڑوں سے باہر ہے۔ اور سفید لباس پہنے جسموں نے اس پُرشباب جسم کے مختلف علاقوں میں توڑ پھوڑ مچا دی ہے۔ ''م'' حواس باختہ ہوگیا۔ گڈی کے پرشباب جسم کو اپنے ہی لوگ لوٹ رہے ہیں۔ آخر یہ کیسے ہوگیا۔ اس نے جائزہ لیا تو حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈوب گیا۔ کیوں کہ ان سفید لباس والوں کے سامنے وہ ایک دم سیاہ ہوگیا تھا۔ اور بھیانک چہرے والا بھی۔

اس نے یہ محسوس کیا کہ خوف و ہراس کی چیخ اس کے سارے جسم پر قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ مگر وہ اب اس علاقے سے بھی کوچ کرنے کی سوچ رہا ہے۔

○○

وامن راؤ کی واپسی

وامن راؤ آج بھی نہیں آیا تھا۔

وہ تو شاید ایک طویل سفر کی جانب کہیں دور چلا گیا تھا۔ ایک ایسی منزل کی طرف جہاں سے کوئی واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ وہ بھی نہیں آیا تھا۔

آخر کیسے آتا؟ اسے تو منزل مل گئی تھی اور ایسے مسافر کبھی واپس نہیں لوٹتے۔

مگر ہم تو برسوں سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کوئی لمحہ، کوئی موقع ایسا نہ تھا جب اسے یاد نہ کیا جاتا ہو۔ جب کبھی گھر میں اس کا ذکر چھڑ جاتا تو پھر آنسوؤں کے چشمے ابل پڑتے۔

کوئی بھی اس سچ پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ وامن راؤ اس دنیا میں نہیں رہا۔ صرف میں ہی اس حقیقت سے واقف تھا۔ بیوی کہتی تھی کہ وامن راؤ مر نہیں سکتا۔ معصوم اور انسان دوست بھی کبھی اس دنیا کو چھوڑ کر جاتے ہیں؟ وہ تو زندہ ہوگا۔ کہیں نہ کہیں! مگر

کہاں؟ اس گتھی کو میں سلجھا نہیں پارہا تھا۔

کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وامن راؤ ایک بار پھر کہیں سے اچانک چلا آئے گا۔ اور ہمارے خالی خالی اور سنسان گھر میں خوشیاں بھردے گا۔ اس کی شرارتوں سے گھر چیخ اٹھے گا۔ ٹی وی بول پڑے گا۔ ہر شئے جھومنے لگے گی۔ شور، چہل پہل اور گہماگہمی کا ماحول پھر سے جاگ جائے گا۔

مگر ایسا کچھ نہ ہوسکا۔ وامن راؤ کیا گیا کہ گھر سے خوشیاں ہی چلی گئیں۔

اس معصوم نے ویران اور کھنڈر زندگیوں میں جان ڈال دی تھی۔ خاموشی اور سناٹے بول اٹھے تھے۔ کالونی میں زندگی کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ وامن راؤ یوں تو ایک معمولی سیدھا سادا لڑکا تھا۔ مگر غیر معمولی خصلتوں کے باعث کالونی میں سب کا پیارا تھا۔ سب کا پسندیدہ تھا۔ اسی لیے کالونی میں اس کی کمی شدت سے محسوس کی جانے لگی تھی۔ کیونکہ وہ بے حد محنتی، چست اور چالاک تھا وہ الہ دین کا جن نہیں تھا، لیکن پھر بھی کالونی کے مکینوں کی چھوٹی موٹی ضرورتوں کو چٹکی بجا کر حل کردیتا تھا۔ نہایت مخلص اور بے لوث تھا۔ کبھی اپنا محنتانہ طلب نہیں کرتا تھا۔

اسے کیا چاہیئے تھا۔ صرف دو وقت کی روٹی اور زیادہ سے زیادہ سر چھپانے کے لیے چھت۔

وہ ہمارا کوئی نہ تھا۔ نہ ہی اس سے ہمارا کوئی رشتہ تھا۔ لیکن ہمیں ہر بار ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا ہمارا ساتھ صدیوں پرانا ہے۔ صدیوں سے ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک تھے، اس لیے ہمارا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ سب کچھ تھا۔

ویسے تو وامن راؤ کے ذمے انگنت کام تھے۔ جن میں بطورِ خاص روز صبح ملک سینٹر سے دودھ اور اخبار، کالونی کے مختلف فلیٹس میں پہنچانا تھا۔ اس کی آمد دراصل صبح کا اعلان ہوتی۔ چرند پرند چہچہانے لگتے۔ فلیٹس جاگ جاتے۔ راستے چل پڑتے، سناٹے بولنے لگتے۔

بچے شور کرنے لگتے تھے۔

طلبہ و طالبات کو کالونی کے باہر بس اسٹاپ تک لے جانا بھی وامن راؤ کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ کسی کا بیگ اور کسی کا واٹر بیگ گلے میں لٹکائے وہ ناچتا گاتا اپنی دھن میں چلا جاتا۔ اس کے علاوہ وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام، جیسے سودا سلف، راشن اور بازار سے اشیائے خوردنی کی خرید و فروخت بھی اسے ہی کرنی پڑتی۔ یہی نہیں بلکہ کبھی کسی کو اسپتال لے جانا تو، کسی کو ریلوے اسٹیشن پہنچانا، کسی کے لیے ٹیکسی لانا اور شام میں بزرگوں کے ساتھ کالونی کے گارڈن میں ایوننگ واک کے لیے جانا۔ کبھی کبھی کالونی کے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنا۔

اسے ٹی وی دیکھنے کا بڑا شوق تھا اور خاص طور پر فلمیں دیکھنے کا۔ گوندا اس کا پسندیدہ ہیرو تھا۔ اسی کے اسٹائل میں وہ ناچتا تھا۔

احمد زری والا نے میری سوچ کے سلسلے کو توڑ دیا تھا۔

''آگے چلیے------آگے جناب------''

اور میں آگے بڑھ گیا تھا۔ ملک سینٹر کی طویل قطار دیکھ کر تو میرے حواس گم ہوگئے تھے۔ پھر نہانا، دھونا، ناشتہ، بس اور آفس سب مجھے منہ چڑا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وامن راؤ کے بغیر ہم اپاہج ہوگئے ہیں۔ کیا واقعی وامن راؤ ہماری زندگی میں اس قدر اہم ہے کہ اس کے بغیر ہم چند قدم بھی چل نہیں سکتے؟

اکثر میرے اندر کوئی سرگوشی کرتا رہتا، کہ وامن راؤ جیسے معصوم لوگ کہاں جاتے ہیں؟ کہیں بھی تو نہیں۔------ ان کے تو صرف جسم ہی غائب ہوجاتے ہیں اور ان کی آتمائیں ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔------ یا وہ ضرور کسی نہ کسی روپ میں واپس آتے ہیں، وہ بھی ضرور آئے گا۔ مگر کس روپ میں؟

''پتہ نہیں۔----'' میں بڑبڑانے لگا۔ اس نے ٹھیک سے دنیا بھی نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی اسے زندگی کے نشیب و فراز کا علم تھا۔ اسے دیکھ کر تو ایسا بالکل نہیں لگتا تھا کہ وہ

اتنی جلدی اس دنیا کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ پھر میں سوچ کی انگلی تھامے اس کی مختصر زندگی کی طرف نکل پڑا۔ ماضی کی بھول بھلیوں کی فلم میری آنکھوں کے سامنے بہت تیزی سے چلنے لگی۔

پہلی بار جب وہ میرے گھر آیا تھا تو میں نے اسے جھڑک کر بھگانا چاہا تھا۔ بارہ تیرہ سال کا ایک منحنی سا چھوکرا، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس، چہرے پر معصومیت لیے ہوئے، خلافِ توقع کام طلب کر رہا تھا۔ کیونکہ اکثر بچے، عورتیں اور لڑکیاں کام مانگنے یا بھیک مانگنے کے بہانے اس کالونی میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر چور ہوتی تھیں اور ان دنوں تو کشمیری اور بنگلہ دیشی عورتوں، بچوں کا ایک ریلا آیا ہوا تھا۔ جو کام کے بہانے بھیک ہی تو مانگتے تھے۔ انہیں دیکھ کر بے حد افسوس ہوتا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ کیا یہ عمر اس بچے کی کام کرنے کی ہے۔ یہ عمر تو اسکول جانے، کھیل کود اور موج مستی کرنے کی تھی۔

اس لڑکے کے چہرے پر معصومیت کے ساتھ ساتھ ڈر و خوف کے سائے بھی نظر آرہے تھے۔ عام طور پر ایسے لڑکوں کو کالونی کے مکین اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہیں ہونے دیتے۔ میں نے بھی اسے بھگانا چاہا تھا مگر بیوی کو وہ پہلی ہی نظر میں بے حد معصوم و مظلوم لگا۔ اسی لیے میں نے اسے بھگانا مناسب نہ سمجھا۔ اسے اندر بلا لیا۔ میں بیوی کے انسانی جذبے کی قدر کرتا ہوا خاموش ہوگیا۔ اس نے اسے پیٹ بھر کھانا کھلایا اور اس کے قریب ہی بیٹھ کر اپنائیت سے باتیں کرنے لگی۔ جیسے وہ کوئی شناسا ہو یا اس کے ساتھ ہمارا کوئی گہرا، صدیوں پرانا رشتہ ہو۔ پھر مجھ سے کہنے لگی۔

''سنیے۔ ہم اسے اپنے گھر میں چھوٹا موٹا کام کرنے کے لیے رکھ لیں؟''

میں نے مناسب نہ سمجھا۔ کسی اجنبی پر فوراً اعتماد کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ بیوی کو میں نے سمجھایا۔

''سنو، اسے رانے پیپر والے کے پاس چھوڑ دیتا ہوں۔ اسے ایک لڑکے کی ضرورت

ہے۔ جو کالونی میں اخبار پہنچانے کا کام کرے‘ اور یہ لڑکا اس کام کے لیے موزوں ہے۔"
بیوی کسی گہری سوچ میں مبتلا‘ کہیں دور نکل گئی۔ مگر پھر فوراً ہی راضی بھی ہو گئی۔ کہنے لگی "ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کیجیے۔"

اس لڑکے کو جس نے اپنا نام وامن راؤ بتایا تھا میں نے رانے کے حوالے کر دیا۔ رانے خوش ہوگیا کیونکہ وہ کالونی کے لوگوں سے اکثر ناراض ہی رہتا تھا۔ اخبار کے بل جو رک جاتے تھے۔ اس نے کام کے ساتھ رہائش کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔

پھر وامن راؤ اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگا۔

روز صبح اخبار اور ملک سینٹر سے دودھ لیکر کے ہر فلیٹ میں پہنچاتا۔ اس کام کے ذریعے اس نے کالونی کے لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کروالیا تھا۔ وہ کبھی کسی کے یہاں کھانا کھالیتا تو کسی کے گھر ناشتہ کرلیتا۔ کسی کے یہاں چائے پی لیتا تو کبھی کسی کے یہاں ٹی وی دیکھنے بیٹھ جاتا اور بچوں کی طرح اس میں کھو جاتا۔ بچوں کے ساتھ کھیلنے لگتا۔ یہی نہیں چھوٹے موٹے کام بھی کرلیتا۔ یہاں سے وہاں‘ ادھر سے ادھر دوڑتا رہتا۔ کہنے کو تو وہ صرف اخبار والا تھا مگر وہ اپنا زیادہ تر وقت کالونی کے فلیٹس ہی میں گزارتا تھا۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے اسے اپنے دل میں جگہ دے دی تھی۔

بیوی بھی اس کی بھولی بھالی باتوں اور معصومیت سے کافی متاثر تھی اور اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ وہ زیادہ تر ہمارے ہی گھر رہتا۔ اپنا بے کار وقت گزارتا۔ بیوی کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا۔ ہر جمعرات کو بیوی اور والد صاحب کو مخدوم شاہ بابا کی درگاہ پر بھی لے جاتا۔

ایک دن بیوی نے مجھ سے کہا "کیوں نہ ہم اسے گود لے لیں۔۔۔"

میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ میں خوب جانتا تھا کہ یہ لڑکا ہم سے اچھی طرح گھل مل گیا ہے۔ بے سہارا اور یتیم بھی ہے‘ مگر ہندو ہے۔ میں نے منع کر دیا۔ عورتوں کی عجلت ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اگر واقعی گود لینا ہے تو کسی

یتیم خانہ سے لے لیں گے۔

انہیں دنوں گاؤں سے والد صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ میں نے ہی انہیں یہاں بلایا تھا۔ تاکہ گھر میں ایک بزرگ کی موجودگی سے سکون بنا رہے اور چھوٹے موٹے کام کرنے' کسی اہم مسئلے پر مشورہ کرنے کے لیے بھی ان کی ضرورت تھی۔

وہ دن بھر گھر میں رہتے۔ ٹی وی پروگرام دیکھتے۔ شام کو جب ایوننگ واک کے لیے نکلتے تو کالونی کا ایک لمبا چکر لگاتے تب اس وقت وامن راؤ ان کے ساتھ ہی ہوتا۔

گھر پر بھی ان سے گاؤں کے واقعات سنتا۔ کبھی وہ کھیتوں کی بات کرتے تو کبھی گاؤں کی پنچایت کی اور کبھی پرامن حالات کی روداد سناتے۔ وہ مزے لے کر سنتا اور خوش ہوتا تھا۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اسے حالات نے ایک منجدھار میں لاکر پھینک دیا تھا اور وہ مسلسل اس سے باہر نکلنے کی کوشش کررہا تھا۔

وہ والد صاحب کی بہت عزت کرتا تھا۔ ان کی ہر بات پر عمل بھی کرتا تھا۔ والد صاحب کے کہنے پر ہی اس نے چڈی ترک کرکے پتلون پہننا شروع کردیا تھا۔ والد صاحب نے اسے بلیو جینس خرید کر دی تھی۔ ان سے اس کی خوب جمتی تھی۔ اس لیے ایک دن اسی نے والد صاحب کو اپنی زندگی کے بارے میں رو رو کر سب کچھ بتایا تھا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے۔ اس کے ماتا پتا پولس کی گولی کا شکار ہوئے تھے۔

جب بابا صاحب امبیڈکر کے مجسمے کی بے حرمتی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا گیا تھا۔ جلوس کالا گھوڑا پر جاکر ختم ہوگیا تھا' تب احتجاجیوں پر پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کی تھی۔ جس میں بچے' بوڑھے' جوان اور عورتیں سبھی شامل تھے۔ وہ خود بھی جلوس میں شریک تھا۔ بابا صاحب سے متعلق جو بھی جلوس نکالا گیا وہ لوگ پورے خاندان کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ اس پولس ایکشن نے بہتوں کو یتیم کردیا تھا۔ کچھ احتجاجی جیل میں پہنچا دیئے گئے تھے اور کچھ اسپتال' کچھ جائے واردات پر ہی تڑپ تڑپ کر دم توڑ چکے تھے۔ اس

واقعہ نے سارے دیش میں ہلچل مچا دی تھی۔ دلتوں پر اس بے جا ظلم و زیادتی کے خلاف ملک گیر پیمانے پر احتجاج ہونے لگا۔ پولس کی بربریت کے خلاف لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔

کافی دنوں بعد جب وہ جیل سے واپس آیا تو سیدھا اپنے گھر کی طرف گیا۔ لیکن دلتوں کی اس بستی کا نام و نشان مٹا دیا گیا تھا۔ جھونپڑوں پر بلڈوزر چلا کر وہاں ایک بڑے مارکیٹ کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی۔ ماں باپ کی موت کے بعد گھر بھی نہیں رہا تھا اور تعلیم بھی نامکمل رہ گئی تھی۔ دربدر بھٹکنا اس کا مقدر بن گیا۔ تب سے وہ اس کالونی کے درمیان رہ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے سب لوگ اس کے اپنے ہی ہیں۔

اور پھر یوں ہوا کہ رات گہری ہوگئی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ رات گہری تو تھی ہی پراسرار بھی تھی۔

اس رات دروازے پر دستک ہوئی۔ میں گھبرا گیا تھا۔ ہمت جٹا کر دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں، سامنے وامن راؤ کھڑا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آگئے جب وہ کام مانگنے اسی طرح اچانک آگیا تھا۔ اس کے چہرے پر صدیوں کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں اس سے مخاطب ہوا۔۔۔

''وامن راؤ، اتنی رات گئے؟ کیا بات ہے آخر؟''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ صاب! سر چھپانے کی جگہ چاہیئے۔ پہلے تو میں کچھ سمجھ ہی نہ سکا۔ وہ روئے جارہا تھا۔ بیوی بھی جاگ گئی تھی۔ میں نے رات میں اس سے کچھ بھی دریافت کرنا ٹھیک نہ سمجھا۔ اور اسے بستر دے کر گیلری میں سلادیا۔ میں سوچنے لگا کہ آخر یہ لڑکا کہاں کہاں رہتا ہے۔ کبھی رانے کے گھر، تو کبھی امبیڈکر کے مجسمے کے نیچے، رام بھروسے ہوٹل میں، آج میرے گھر۔ بیوی متعجب تھی، رات بھر بے چین رہی۔

سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہی وہ وامن راؤ کے پاس پہنچ گئی۔

وامن راؤ نے روتے ہوئے بتایا کہ اس نے اب رانے کی نوکری چھوڑ دی ہے۔ رانے اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ مجھ سے شراب منگواتا، گلاس بھرواتا اور میں رات بھر اس کا گلاس

ہی بھرتا رہ جاتا۔ ایک دن تو اس نے حد ہی کر دی۔ مجھ سے کہنے لگا۔ وامن راؤ کالونی کے آوارہ لڑکوں کو چرس، اور گردنہ بیچو۔ وہ گرد سپلائی کرنے کا کام بھی کرتا تھا۔ یہ راکانے دراصل کوئی بھیانک آدمی ہے۔ جو جوئے اور دارو کے اڈے بھی چلاتا ہے۔ میں نے صاف صاف انکار کر دیا کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا' تو اس نے میری خوب پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔

وہ زار و قطار رونے لگا۔ مجھے اس پر ترس آگیا۔ اتنا چھوٹا بچہ اور یہ گندگی اف! کتنا ظلم ہے؟ اس کا تو بچپن ہی کہیں کھو گیا ہے۔ ہے نا؟ بیوی روہانسی ہوکر کہنے لگی۔ اسے یہیں رہنے دیجئے" گیلری تو خالی ہی ہے نا۔ والد صاحب بھی تو ہیں یہاں' پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کس سوچ میں گم ہوگئے آپ؟

"نہیں۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ جیسا تم مناسب سمجھو"

تب سے وامن ہمارے گھر میں رہتا ہے ہمارا ہمدرد' دکھ سکھ کا ساتھی۔۔۔۔ دوستا! اب والد صاحب کو پیارا ساتھی مل گیا۔ وہ اپنے بچوں کی طرح اسے پیار کرتے۔ کہانیاں سناتے' کالونی کے آوارہ لڑکوں کے متعلق بتاتے اور ان سے دور رہنے کی تلقین کرتے۔ سمجھاتے نصیحتیں کرتے۔ اس کے ساتھ کھیلتے۔ وہ بلا ناغہ شام کی چہل قدمی کے لیے والد صاحب کے ہمراہ ہوتا۔ ویسے بھی والد صاحب کو اس عمر میں سہارے کی ضرورت تھی وہ کافی بوڑھے ہو چکے تھے اور وامن راؤ ان کا سہارا بن چکا تھا۔ انہیں دیکھ کر تو مجھے اپنے سہارے کی یاد آجاتی۔ ہماری دیرینہ خواہش تھی کہ گھر میں ایک چشم و چراغ ہو۔ جو بڑا ہوکر ہمارا سہارا بنے۔ مگر یہ خواہش ادھوری ہی رہ گئی۔ بچوں کی کلکاریوں' شرارتوں' شور و غل' چہل پہل' بھاگ دوڑ سے یہ گھر کوسوں دور تھا۔ ہم بچے کے لیے کئی برسوں سے تڑپ رہے تھے۔ علاج کے ساتھ ساتھ دوا اور تعویذ کا بھی سہارا لیا جاتا۔ حاجی ملنگ سے لے کر خواجہ غریب نواز کے آستانے تک گئے۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخرکار تھک ہار کر سب کچھ خدا پر چھوڑ دیا۔

والد صاحب بار بار کہتے کہ اپنے خاندان کو آگے بڑھانے کے لیے بیٹا ہونا ضروری ہے۔

وہ تو دوسری شادی کے لیے بضد تھے۔ مگر میں نے انکار کردیا تھا۔ اسی لیے والد صاحب اور میری بیوی کے درمیان سرد جنگ چلی آرہی تھی۔ اب تو برسوں بیت گئے۔ بچے کی کمی کے ساتھ زندگی اطمینان سے گزر رہی تھی۔

ان دنوں وامن راؤ بہت مصروف ہوتا تھا جب کالونی میں گنپتی کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا۔ بڑا سا پنڈال، اس میں گنیش جی کی مورتی اور گنیش بھکت پوجا کرتے ہوئے بھجن گاتے۔ رات بھر لاوڈاسپیکر پر دھارمک گیت بجتے۔ یہ سلسلہ دس دنوں تک چلتا۔ ایسے موقع پر پولس بھی اعتراض نہیں کرتی۔ پھر دس دنوں کے بعد مورتی کو لاد کر جوہو سمندر کنارے لے جایا جاتا اور بڑی عقیدت سے سمندر میں ڈبویا جاتا۔

یہ ہر سال ہوتا ہے۔

اس سال بھی وہی سب ہوا۔ ڈرامے، بھجن، گانے، تماشے، کھیل کود کے مقابلے، انعامات کی تقسیم۔ - - - سماں بندھ گیا تھا۔ ایسے وقت میں وامن راؤ گھر سے پنڈال اور پنڈال سے گھر، اس فلیٹ سے اس فلیٹ تک چکر لگاتا رہتا۔ اور جب موقع ملتا گنیش جی کی مورتی کے قریب بیٹھ جاتا۔ پتہ نہیں کن خیالوں میں گم ہوجاتا خوب روتا رو رو کر برا حال کرلیتا۔ پتہ نہیں کیوں؟

پھر ایک دن گنیش وسرجن کا موقع آگیا۔ خوب گلال اڑایا جانے لگا۔ ناچ گانے، تاشے باجے ڈھول لیزم، کھیل تماشے ہونے لگے۔ جوہو لے جانے کے لیے گنیش جی کی مورتی لاری میں رکھی گئی۔ گنیش بھکت لاری کے پیچھے چلنے لگے۔ آگے آگے کالونی کے لڑکے ناچتے گاتے۔ میں نے دیکھا وامن راؤ گلال میں نہا چکا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ ناچنے میں مشغول تھا اس دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ جیسے زندگی کا لطف بس اتنا ہی ہے۔ میں اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

رات آدھی سے بھی زیادہ بیت چکی تھی۔ سب لوگ گھر پر وامن راؤ کا انتظار کر رہے تھے۔ جوہو سے اب تک گنیش بھکت واپس نہیں لوٹے تھے۔ میری بے چینی بڑھنے لگی

تھی۔ بیوی تو ہر ایک منٹ میں اس کے متعلق دریافت کرنے لگی تھی۔ ایک ایک لمحہ اسے صدیوں پر محیط محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر کالونی کے باہر میدان میں دیکھا تو وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ چہ مہ گوئیاں ہو رہی تھیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں گھر سے نکل کر وہاں پہنچ گیا۔ سبھی مجھے دیکھ کر خاموش ہوگئے تھے۔ مجھے بے حد تعجب ہوا جب ان میں وامن راؤ کہیں نظر نہیں آیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے فکر مندانہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''وامن راؤ نہیں آیا؟ کہاں رہ گیا وہ ----؟''

سب ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ نظریں نیچی ہوگئیں۔ میں نے جھلا کر کہا۔ "کیا ہوا'کچھ بتاؤ بھی؟ آخر تم لوگ چپ کیوں ہو؟ وامن راؤ کہاں ہے؟ تم نے اسے کہیں چھوڑ تو نہیں دیا؟''

تب ایک لڑکے نے ڈرتے ڈرتے اور روتے روتے کہا۔ ''انکل! ہم نے اسے کہیں نہیں چھوڑا وہ تو خود ہم سے چھوٹ گیا۔ گنیش جی کی مورتی کے ساتھ ہی سمندر میں ڈوب گیا۔''

"کیا؟ ---'' ایک سرد آہ میرے منہ سے نکلی اور مرے وجود کو جھنجھوڑ کر گذر گئی۔ میں بدحواسی کے عالم میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے مرے قدم من من بھر وزنی ہوگئے ہیں۔

صرف وامن راؤ ہی نہیں اور بھی کئی لوگ ڈوبے تھے۔ گنپتی وسرجن ایک سانحہ میں تبدیل ہوگیا تھا۔ سرکار نے لواحقین کے آنسو پونچھنے کے لیے مرنے والوں کے پسماندگان کو ایک لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا تھا۔

ہجوم کی آوازیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔ اس کی لاش پولس کے قبضے میں ہے۔ پولس نے کہا کہ جو وارث ہو وہ کل پولس اسٹیشن آکر لے جائیں۔

بیوی یہ خبر سن کر زار و قطار رونے لگی۔ گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ وہ اپنے ہوش و

حواس کھونے لگی۔ ہم پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ کر گرا تھا۔ اس نے ہمارے جذبات و احساسات کو ایک پل میں روند ڈالا تھا۔ وہ تو ایک اجنبی تھا مگر پھر بھی اس سے اس قدر اپنائیت ہوگئی تھی جیسے وہ ہمارا سب کچھ تھا۔

رات ہم پر بھاری تھی۔ والد صاحب بھی اس صدمے سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ بیوی کی آنکھیں تو جیسے آنسوؤں کے دریا بہا رہی تھیں۔ سورج کے انتظار میں آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ رات بھر ہم وامن راؤ کے متعلق سوچتے رہے اور خوب روتے رہے۔

وامن راؤ کی لاش لینے میں صبح پولس اسٹیشن پہنچ گیا۔ انتم سنسکار کرنے کا تو میرا ہی حق تھا۔ مجھے ایسا ہی لگتا تھا۔ پولس اسٹیشن پر بے انتہا بھیڑ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کیونکہ کالونی کے کئی لوگ اپنے اپنے طور پر وامن راؤ کی لاش لینے پہنچ گئے تھے۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوگیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کے بعد لاش ہمارے حوالے نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ ہم وامن راؤ کے وارث قرار نہیں دیے گئے تھے۔ رانے وامن راؤ کا وارث قرار دیا گیا تھا۔ لاش کے وارثوں میں سب سے آگے رانے تھا۔ اس نے انتم سنسکار کی تیاریاں کرلی تھیں۔ اسے دیکھ کر کالونی کے بہت سے ہم لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ میں بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ آج مجھے محسوس ہوا کہ وامن راؤ یتیم نہیں تھا۔ مجھے اس بات کا دکھ تھا کہ رانے نے مجھ سے میرے اپنے وامن راؤ کو چھین لیا اور مجھے اس کا انتم سنسکار کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔

ہمیں اس رنج کو اٹھائے ہوئے، سینے سے لگائے ہوئے برسوں بیت گئے۔ وامن راؤ کی ایک تصویر تھی ہمارے گھر میں تصویر میں وہ والد صاحب کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا، جیسے وہ ان کا سہارا ہو، بڑھاپے کی لاٹھی ہو، میری نگاہ جب بھی اس تصویر پر جاتی ہے، میں خود کو بے سہارا محسوس کرتا ہوں۔ میں کسی نو وارد وامن راؤ کی دستک کا منتظر ہوں۔ میرے دل کے، اور میرے گھر کے، دروازے اب بھی کھلے ہیں!!

●●

تعاقب
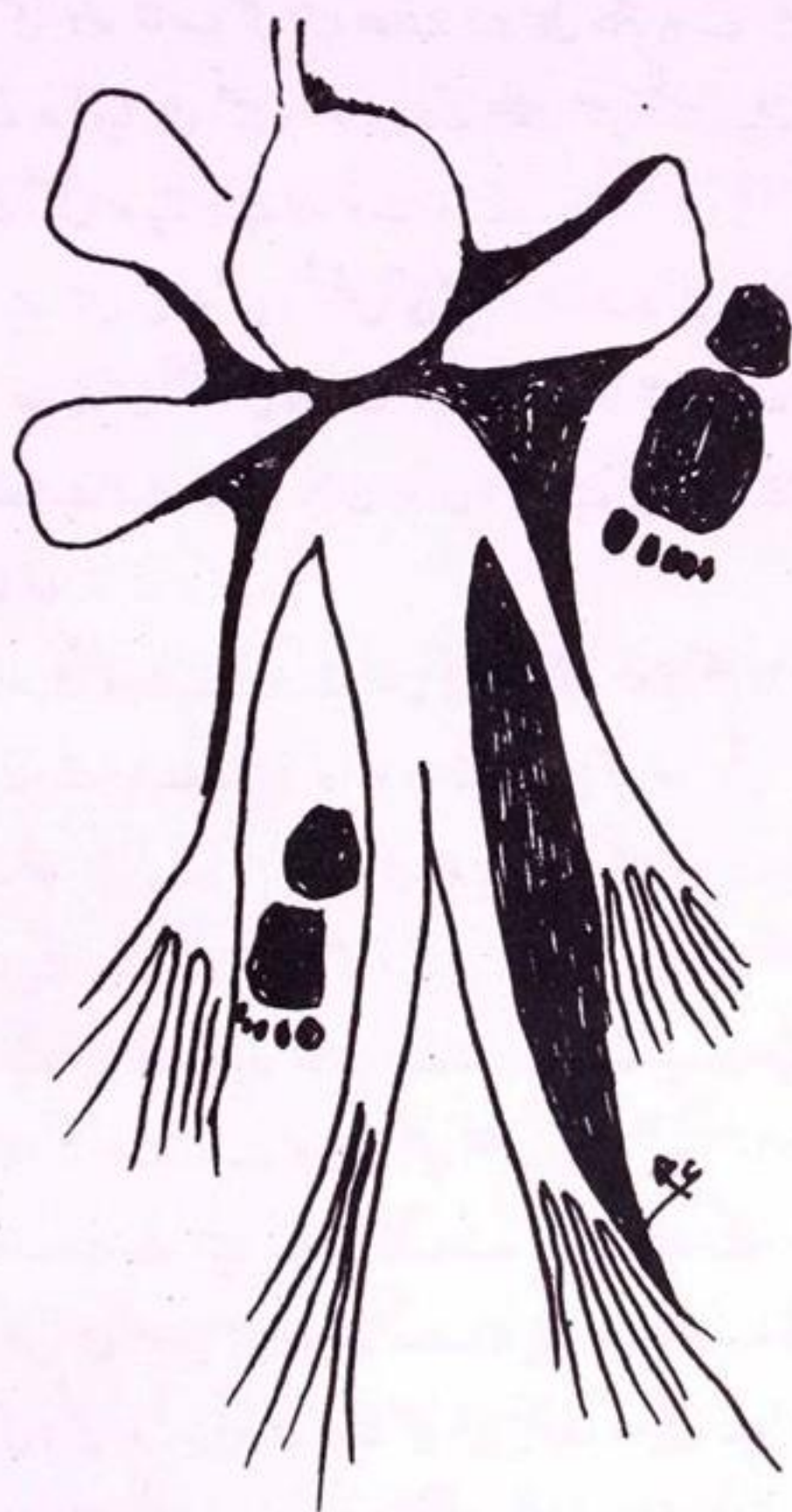
بیوی گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بد حواسی سے کہنے لگی۔

''اب اٹھ بھی جائیے ۔۔۔ دیکھیے ۔۔۔ باہر پولس آئی ہے ۔۔۔ پولس ۔۔۔؟ ہاں ۔۔۔ پولس ۔۔۔!''

ایک بار پھر ۔۔۔ پولس کا نام سنتے ہی میرے حواس خطا ہوگئے۔ اور ہاتھوں کے سارے پرندے اچانک اڑ گئے۔ میں اپنے آپ کو ملزم کے کٹہرے میں کھڑا محسوس کرنے لگا۔

پولس کئی دنوں سے وینکٹ رمن کی موت کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھا رہی تھیں۔ میں نے اور چال کے مکینوں نے وینکٹ رمن کے بارے میں تمام حقائق سچ سچ بتادیئے تھے۔ پولس کی تحقیقات کا یہ سلسلہ پتہ نہیں کب تک چلے گا۔ جب تک تحقیقات مکمل نہیں ہوجاتی تب تک پولس اسٹیشن کے چکر لگانے ہی پڑیں گے یا کبھی پولس خود اس چال میں آدھمکے

گی۔

بیوی بڑبڑانے لگی تھی۔

"اس وینکٹ رمن نے تو ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ مرنے کو تو مرگیا مگر پریشانیاں ہمارے حصے میں چھوڑ گیا۔ اب کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ جائیے بھی' پولس سب کا بیان لکھ رہی ہے آپ بھی صاف صاف کہہ دیجئے کہ ہم اسے بالکل نہیں جانتے وہ گاندھی نگر میں رہتا تھا ضرور۔ اور ہمارا پڑوسی بھی تھا۔ بس اس سے زیادہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"

میں اپنے دماغ کی ساری کھڑکیاں اور دروازے وا کرتا ہوں اور باہر نکل جاتا ہوں۔ وینکٹ رمن کے دروازے پر کافی بھیڑ تھی۔ پولس مختلف لوگوں سے ایک بار پھر وہی سوالات پوچھ رہی تھی۔

لاش ملنے کی جگہ کا معائنہ اور پوچھ تاچھ یہ سب پریشان کن تھا۔ چال میں پولس کی بار بار آمد سے مکینوں میں خوف و ہراس پیدا ہوگیا تھا۔ وینکٹ رمن کی موت ویسے تو خودکشی تھی۔ لیکن کچھ لوگ اسے قتل سمجھتے تھے۔ محلہ کی بزرگ خواتین اور تجربہ کار لوگ اس موت کو ایک غریب' لاچار' بےبس اور دکھی۔ باپ کا زندگی سے فرار سمجھتے تھے۔ میں اسے قتل ہی تصور کرتا تھا۔ قاتل کون تھا؟ یہ میں جانتا تھا اور شاید نہیں بھی!

پولس کو میں نے بیان دیا تھا۔

"وینکٹ رمن ہمارا ایک اچھا پڑوسی تھا۔ اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی چال کے مکین اس سے نفرت کرتے تھے۔ کبھی کبھی اس پر غصہ ضرور ہوتے تھے' اس وقت جب وہ رات کو دارو پی کر آتا تھا اور خوب گالی گلوج کرتا تھا۔ اپنی پتنی کو مارتا' خوب شور کرتا' پھر نشے میں چور' سوجاتا' ایسے موقع پر لوگوں کی نیندیں حرام ہوجاتی۔ تب اس پر لوگ غصہ ہوجاتے' اسے برا بھلا کہتے تھے۔

اس کی جوان لڑکیاں یہ سب دیکھتی رہتیں۔ اور اندر ہی اندر کوھتی رہتیں۔ شرمندگی کی وجہ سے کسی سے نظریں بھی نہیں ملا پاتی تھیں۔ وینکٹ رمن کو پتہ نہیں کون سا غم کھائے

جارہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ شراب میں ڈوب کر ذہنی سکون حاصل کرتا تھا۔ چال کے لوگوں کو بھی اس سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی بہت بڑے حساب میں الجھ گیا تھا۔ شاید زندگی کا حساب!

پولس جب مجھ سے سوالات پوچھ چکی تو میں واپس اپنے گھر آگیا تھا۔ بیوی اور بچے کسی انجانے خوف سے دبکے بیٹھے تھے۔ جیسے مذبح خانہ میں جانور۔ - - بیوی مجھ پر برس پڑی۔

"آخر کب تک آپ اس چال میں رہیں گے۔ گھر بدل کیوں نہیں دیتے کوئی اور گھر تلاش کیجئے۔ اب اس چال میں رہنا مشکل ہوگیا ہے۔ آئے دن یہاں جھگڑے ہوتے ہیں۔ کبھی پانی پر تو کبھی گٹر صاف کرنے پر' آپس میں ٹھن جاتی ہے۔ جھگڑے' گندگی شور شرابہ' اور دوسری تکلیفیں تو قابلِ برداشت تھیں۔ مگر اب تو یہاں ایسی موتیں بھی ہونے لگی ہیں۔ اور یہ پولس! پہلے کبھی اس چال میں پولس کا گزر نہیں ہوا۔ لیکن اب نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ پولس بار بار ہمیں پریشان کررہی ہے۔ جیسے وینکٹ رمن کی موت میں ہمارا ہاتھ ہو۔"

"تم خوا مخواہ ڈر رہی ہو۔ پولس اپنی تحقیقات مکمل کررہی ہے۔ ان کا جو کام ہے انھیں کرنے دو اور ہمارا جو فرض ہے وہ ہمیں کرنا چاہیے۔ یعنی پولس کی تحقیقات میں ان کے ساتھ تعاون کرنا۔ سمجھیں۔ - - - -"

"ہاں - - - ہاں سمجھ گئی۔"

بیوی کے چہرے کا سورج ڈر اور خوف کے بادلوں میں جاچھپا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس ذہنی کشمکش اور تذبذب سے باہر نکالنا چاہ رہی تھی۔ مگر ناکام ہوگئی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی وینکٹ رمن کی موت کی وہ بھی ذمہ دار ہے اور چال کے لوگ بھی۔

میں اسے بار بار سمجھاتا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ چپ ہوجاتی۔

مگر پتہ نہیں وہ کتنے اندیشوں اور وسوسوں کا شکار تھی جو اسے اندر ہی اندر پریشان

کیے ہوئے تھے۔ وہ بالکل سچ کہہ رہی تھی کہ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اتنے برسوں میں اس چال میں پولس کا داخلہ

ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ وینکٹ رمن کی لٹکی ہوئی لاش اسے جب تب دکھائی دے جاتی وہ اس لاش سے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو بچانا چاہتی تھی۔ اسی لیے بار بار اصرار کرتی کہ اس گھر کو' اس چال کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں جہاں وینکٹ رمن کی یاد کی پرچھائیں تک نہ پہنچے۔

وینکٹ رمن کی موت معمہ بنتی جارہی تھی۔ چال کے سبھی لوگوں نے دیکھا تھا کہ وینکٹ رمن نے اپنے گھر میں سلنگ فین سے لٹک کر خودکشی کی تھی۔ لوگ وینکٹ رمن کی عبرت ناک موت سے بےحد فکر مند بھی ہوگئے تھے۔ طرح طرح کی باتیں اور قیاس آرائیاں ہوتیں۔ لوگوں کو تعجب اس بات پر تھا۔ کہ وینکٹ رمن نہایت ہی ڈرپوک تھا وہ صرف اپنی پتنی پر ہی ساری بہادری خرچ کرتا تھا۔ لیکن ایک معمولی چوہے سے ڈر جاتا تھا۔ چال کے لوگوں سے تو وہ اس قدر ڈرتا تھا جیسے وہ ان کا مقروض ہو یا اس نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو۔ کیا ایسا شخص خودکشی کرسکتا تھا۔ شاید نہیں؟

وہ بڑا بھیانک منظر تھا۔

وینکٹ رمن کی لٹکی ہوئی لاش دیکھ کر تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ اور میں لڑکھڑا گیا تھا۔ فوراً اپنے گھر آگیا تھا۔ لاش بہت دیر تک لٹکتی رہی تھی۔

پولس آئی' پنچ نامہ ہوا۔ پوچھ تاچھ کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی تھی۔ پھر تو پولس کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ چال میں عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔ سبھی لوگ اس موت سے کافی دکھی اور غمگین ہوگئے تھے۔ انھیں بھی ہر جگہ وینکٹ رمن دکھائی دیتا۔ وہ اس سے دور بھاگنا چاہتے تھے۔ میں بھی چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی وینکٹ رمن کہیں سے آجائے گا اور کہے گا۔ چلو چائے پلاؤ' بیڑی دلاؤ ۔ ۔ ۔ کیونکہ اسے جتنا قریب سے میں جانتا تھا۔ شاید چال کے دوسرے لوگ نہ جانتے ہوں وہ میرا قریبی

پڑوسی تھا۔ آندھرا پردیش کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا چھوٹا سا خاندان پتنی، دو جوان لڑکیاں اور ایک لڑکے پر مشتمل تھا۔ لڑکیاں شادی کے لیے بیٹھی تھیں اور بڑا لڑکا آنند اوباش لڑکوں کی صحبت میں آوارہ بن گیا تھا۔ وینکٹ رمن نہایت غریب مگر محنتی تھا۔ پریل کی گل مہر سلک مل میں کام کرتا تھا۔ اس کی پتنی آس پاس کے گھروں میں کام کرتی اور بچوں کو سنبھالتی تھی۔ بے حد شریف عورت تھی۔ پتہ نہیں وہ وینکٹ رمن کے گھر کیسے پہنچی۔ شاید قسمت لے آئی تھی۔

ویسے وینکٹ رمن بھی شریف اور سیدھا سادا آدمی تھا اس میں ایک ہی عادت بری تھی کہ وہ جب رات کو شراب پی کر آتا تو پتنی کو خوب مارتا اور تھک کر سوجاتا۔ شروع میں روز کی لڑائی اور گالی گلوچ سے چال کے لوگ کافی پریشان ہوئے تھے۔ مگر دھیرے دھیرے ان سب کی عادت ہوگئی تھی۔ جب تک وینکٹ رمن شراب کے نشے میں چور گھر نہیں آتا اور مار پیٹ نہیں کرتا تب تک بہت سے لوگوں کو نیند نہیں آتی۔

گل مہر سلک مل میں جب طویل ہڑتال کی وجہ سے تالہ بندی ہوگئی تو وہ بے روزگاری کا شکار ہوگیا۔ اور اس نے اپنے آپ کو شراب میں ڈبو دیا۔ جس کی وجہ سے گھر میں اس کے اور بیوی بچوں کے درمیان ٹینشن بڑھنے لگا۔ وہ آپس میں لڑ جاتے مفت کا تماشہ ہو جاتا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ وینکٹ رمن جیسے آدمی نے خودکشی کیوں کی اور اگر واقعی اس کا قتل ہوا ہے تو کس نے کیا؟ وینکٹ رمن نے تو خودکشی کی تھی پنکھے سے لٹک کر۔ اس نے شاید اپنے گھر والوں سے تنگ آکر اپنے آپ کو مار دیا تھا۔ کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ وینکٹ رمن کی بڑی لڑکی بیما کا ایک مسلم لڑکے اکبر خان عرف راجو کے ساتھ عشق چل رہا تھا۔ راجو بیئر بار کا مالک تھا۔ وہ اکثر اس لڑکے کے ساتھ غائب رہتی تھی۔ بڑا لڑکا آنند کام تو کچھ نہیں کرتا تھا بس دن بھر نکڑ پر بیٹھا رہتا یا آوارہ گردی کرتا۔ اب وہ گرد بھی پینے لگا تھا۔ اس کی چھوٹی لڑکی جیا ایک سوشل ورکر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اسے بھگانے میں اس کی بڑی بہن کا ہاتھ تھا۔ اور ماں تو ویسے بھی قسمت کی ماری تھی وہ سب کے لیے

آنسو بہاتی' بھگوان سے دعائیں کرتی تھیں۔ شاید وینکٹ رمن یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے آپ کو شراب میں ڈبو دیا تھا۔ چال میں تو یہ بھی کہا جانے لگا تھا کہ اس کی پتنی بھی بدچلن ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو شک بھری نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ مگر میں جانتا تھا۔ اس شریف عورت کو۔ اس میں جو خوبیاں تھیں وہ بہت سے شریف کہلائے جانے والے لوگوں میں بھی نہیں ہونگی۔

وینکٹ رمن آدمی بہت اچھا تھا۔ اتوار کو ہم چال کے آخری سرے پر رام بھروسے ہوٹل میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے تھے۔ وہ بڑے مزے کی باتیں کرتا تھا۔ اور خوب ہنستا تھا۔ ہنس مکھ آدمی جو تھا۔ وہ شیواجی بیڑی' پیتا تھا۔ خوب دھواں چھوڑتا تھا۔ اس کے نزدیک زندگی کی حقیقت شاید اتنی ہی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ چال کے لوگوں نے اس کے گھر والوں کو بد اخلاقیوں کی وجہ سے چال سے باہر نکالنا چاہا مگر وینکٹ رمن کی شرافت اور اپنا پن آڑے آجاتا۔ اس نے چال میں کبھی کسی سے کوئی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی کبھی کسی کی بے عزتی کی تھی۔ وہ سب کا ساتھی اور مددگار تھا۔ اس نے اپنی ملنساری کے طفیل سب کا دل جیت لیا تھا۔ وینکٹ رمن کی شرافت کی وجہ سے اس کے گھر والے ہمیشہ چال والوں کے عتاب سے بچے رہے۔ اور انھیں کسی مصیبت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔

جب بابو مستری کے سر پر پڑوسی کی چھت گر پڑی تھی اس وقت وینکٹ رمن نے ہی اسے اسپتال میں ایڈمیٹ کرایا تھا۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے واقعات اور شادی بیاہ اور بیماری و موت میں بھی وہ پیش پیش رہتا۔ یہی نہیں تہواروں کے موقع پر بھی سب کا ساتھ دیتا۔ خاص طور پر گنیش چترتھی پر دس دن تک ویڈیو فلم کا انتظام کرتا۔ چال کے لوگوں سے چندہ کرتا اور فلم دکھاتا۔ پرساد تقسیم کرتا' پوجا کا اہتمام بھی کرتا۔ وینکٹ رمن کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ کہانی کا کوئی کردار ہو۔ جو کہانی سے باہر آگیا ہو۔ ایسے کردار عام زندگی میں دور دور تک دکھائی نہیں دیتے۔

ان دنوں بیوی مجھ سے ناراض سی تھی۔ غصہ اور ناراضگی نے اسے چڑچڑاہٹ کا شکار بنا دیا تھا۔ وہ اس چال کو چھوڑنے پر اصرار کرنے لگی تھی۔ بار بار یہی کہتی یہاں سے نکل چلو۔ یہ شریفوں کے رہنے لائق جگہ نہیں۔ اب تو یہاں خودکشی بھی ہونے لگی ہے۔ پولس کا آنا عام بات ہوگئی ہے۔ کیا شرابیوں، غنڈوں موالیوں اور پولس کے مستقل خوف کے درمیان کوئی شریف آدمی رہ سکتا ہے۔ بس بہت ہوگیا۔ اب ایک اچھا سا فلیٹ خرید لو اور یہاں سے نکل چلو۔ پرسکون ماحول میں۔

میرے لیے فلیٹ خریدنے کا خیال جیسے خواب ہوگیا تھا۔ آفس میں تمام ساتھی ٹیبل کے نیچے کی کمائی سے خوب صورت فلیٹوں میں پہنچ گئے تھے۔ ایک میں ہی تھا جو اپنی سچائی اور ایمانداری کو گلے لگائے بیٹھا تھا۔ یا مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ کام میں نہ کرپاؤں مگر ایک دن نریندر کمار نے مجھے وہ گر بھی بتادیا جو میں جانتا نہ تھا۔

پھر تو سب کچھ بدل گیا۔ نوٹوں کی بارش ہونے لگی میں اس بارش میں بھیگتا ہی چلا گیا۔ اور ایک ایسے راستے کی طرف چل پڑا جہاں سونے چاندی کی چمک تھی۔ روپیوں کی ریل پیل تھی۔ اب نہ بینک سے لون لینے کی ضرورت پڑی اور نہ ہی کسی سے قرض لینے کی۔ پھر میں نے ممبئی کی مضافات ممبرا میں ایک بہت بڑا فلیٹ خرید لیا۔

اس چال کو چھوڑتے وقت میں کافی جذباتی ہورہا تھا۔ کیونکہ میں نے ۲۰ سال یہیں گزارے تھے۔ یہیں میں نے اپنے کیریر کی شروعات کی تھی۔ میں یہیں دلہن بیاہ کر لایا تھا۔ یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے اس قدر گھل مل گئے تھے جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے۔ دکھ درد بانٹتے، کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ مجھے اب بھی وینکٹ رمن کا ہنستا ہوا چہرہ اور لٹکا ہوا جسم دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہو۔ اتنی ساری یادیں چھوڑ کر کیوں جارہے ہو۔ میرا دل بھر آیا تھا

اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے چھلک پڑے تھے۔

ممبرا میں ہم ایک بہت بڑے فلیٹ میں شفٹ ہو چکے تھے۔ سبھی نے گھر کو خوب سجایا تھا۔ بیوی بہت خوش تھی۔ وہ کہنے لگی کہ ہم نے ایک منحوس جگہ سے نجات حاصل کر لی۔ بچے بھی خوش تھے۔ اس نئے ماحول اور اجنبی لوگوں کے درمیان انھوں نے بہت جلد اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ میں بھی بےانتہا خوش تھا۔ اور بیوی بچے اس چال اور وہاں کے گندے اور تھرڈ کلاس لوگوں کو دھیرے دھیرے فراموش کر رہے تھے۔ مگر میں شاید ان لوگوں کو بھول نہ پاؤں۔ کیونکہ میرے ماضی کی خوش گوار یادیں وہیں سے وابستہ تھیں۔ مجھے تو ہر موڑ پر وینکٹ رمن دکھائی دیتا تھا۔ جیسے وہ میرا انتظار کر رہا ہو۔

ساتھ ساتھ ہو،

میرا حوصلہ بڑھاتا ہوا

گپ شپ کرتا ہوا۔

برسوں بعد آج مجھے اس چال کی اور وہاں کے مکینوں کی بہت یاد آ رہی ہے۔ جہاں میں نے بیس برس گزارے تھے۔ جہاں کے ہر گھر کا حال میں جانتا تھا۔ لیکن آج میرے گھر کا منظر بھی بدل گیا تھا کیونکہ اب میرا بڑا لڑکا جو انجینیر نگ کے فائنل ایر میں ناکام ہو چکا ہے۔ وہ کالونی کے اپنے دوستوں کی صحبت میں گرد پینے لگا ہے۔ اور بیٹی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اخلاقی حدوں کو پار کر کے کالونی کے غنڈے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اب ہماری ساری امیدیں چھوٹے بیٹے سے وابستہ ہیں۔ وہ اس سال میڈیکل کے فائنل میں ہے۔ ادھر میرا ریٹائرڈمنٹ بھی قریب ہے۔

اس درمیان مجھے وینکٹ رمن بہت یاد آیا۔ اسے میں نے اپنے سے بہت قریب محسوس کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وینکٹ رمن میرے وجود کی اندھیری کوٹھری میں آکر بس گیا ہے۔ اب ہر روز میں شراب پی کر گھر لوٹتا تو بیوی سے لفظی جھڑپ ہو جاتی۔ اور ہم دونوں خوب لڑتے۔ ہمارا چھوٹا بیٹا یہ سب تماشہ دیکھتا رہتا۔ بلڈنگ کے دوسرے فلیٹ تک ہماری

واز نہیں پہنچ پاتی تھی۔ بیوی بھی اندر ہی اندر موم کی طرح پگھلنے لگی تھی۔ وہ اپنے بچوں سے مایوس ہوگئی تھی۔ بس امید کی ایک ہی کرن تھی۔ چھوٹا بیٹا۔ وہ اب تک ساری برائیوں اور بری صحبتوں سے دور تھا۔

اس دن میں آفس سے چھوٹ کر سیدھا گھر جانے لگا راستے میں وینکٹ رمن' اس کی ملنساری' شرافت اور پھر اس کی موت کے بارے میں سوچتا رہا' میں نے آج اپنے اندر اس کے درد کو محسوس کیا۔ وہی درد اور وہی احساس جو وینکٹ رمن کی زندگی کا حصہ تھا۔ اتفاق سے اس دن میں نے شراب کو چھوا تک نہیں تھا۔

بیل دبائی تو بیوی نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر تعجب خیز انداز میں چیخ پڑی۔ اور بےہوش ہوگئی۔

میں اس کی طرف دوڑا۔ پھر اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ بھی نہ تھا۔ بیوی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ہوش میں آنے لگی۔ مگر دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔ - - "آپ کے ساتھ وہ بھی تھا۔ وہ کون؟ - - - وہی - - - ہاں ہاں وہی - - - !!"

میں سمجھ گیا تھا کہ بیوی بھی اسے بھلا نہیں پائی ہے۔ اس کی یادیں ہمارا تعاقب کر رہی ہیں۔ اسے بھلانا اب مشکل ہے۔

بیوی جب ہوش میں آئی تو گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اور وہ ٹکٹکی باندھے سلنگ فین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ - -

وہاں کچھ نہیں ہے۔ ادھر مت دیکھو۔ - - میں اسے بار بار کہہ رہا تھا۔ دلاسہ دے رہا تھا۔ مگر اس نے تو جیسے اپنی نظروں کے تیر چھت میں گاڑ دیئے تھے۔ پھر اس نے انگلی سے اشارہ کر کے کہا

"- - - وہ دیکھو - - -"

میری نظریں بھی پنکھے کی جانب اٹھ گئیں تو میں اپنے آپ کو حیرت و خوف کی خلیج میں گرتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

کیونکہ اس بار پنکھے سے وینکٹ رمن نہیں میں خود لٹک رہا تھا۔——— ●●

آدم ہاؤسنگ سوسائٹی

میں جس گھر میں منتقل ہوا تھا۔ وہاں مجھ سے پہلے آدم نام کا کوئی شخص رہتا تھا۔ جو ایک معمولی، سیدھا سادا، اور بھولا بھالا آدمی تھا۔ پولس کے ظلم اور جبر کی وجہ سے وہ اپنے محلہ میں مشہور ہوگیا تھا۔ اس کے چھوٹے سے فلیٹ پر اندھا دھند تلاشی کا عتاب نازل ہوا تھا، کھڑکیاں اور دروازے توڑ دیئے گئے تھے۔ وال کلاک کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے مقدس آیات کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ فرش اور دیواروں پر جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ ساز و سامان بکھرا ہوا تھا۔ گودریج کی الماری کی شکل بگاڑ دی گئی تھی۔ آدم کی تصویر والے فریم کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ سارا منظر دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے مسجد کی شہادت پر رونما ہونے والے فساد کی ویڈیو فلم چلنے لگی اور ایک لمحہ کے لیے میں خوف سے گزر گیا۔

آدم کے چھوٹے بھائی رستم نے مجھے درمیان میں ہی روک دیا اور کہا۔

"کہاں کھو گئے آپ! کیا سوچنے لگے۔ کیا کوئی خوفناک منظر یاد آگیا۔ - -

یا پھر ———— !

نہیں ———— کچھ نہیں ———— بس یونہی ————

یہ لیجئے ———— چابی —— اور یہ سب ٹوٹا پھوٹا سامان میں لیے جا رہا ہوں۔ اب یہی آدم کی یادوں کا سرمایہ ہے۔ جاتے جاتے اس نے یہ بھی کہا کہ آپ جب تک چاہیں یہاں رہ سکتے ہیں۔ احمد بھائی دودھ والا نے آپ کو بھیجا ہے۔ وہ آدم کے بہت اچھے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ ویسے بھی اب آدم اس دنیا میں نہیں رہا۔ اور میں یہاں اگر رہ نہیں سکتا۔ آخر کب تک رہوں گا۔ ایک دن تو مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔ رستم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور میری بھی آنکھیں بھر آئیں ——

پھر میں نے کھڑکیاں اور دروازے درست کروائے۔ دیواروں پر سفیدی کروائی۔ فرش دھلوایا، فلیٹ کی صفائی کرنے کے بعد سب سے پہلے خیر و برکت کے لیے قرآن خوانی کروائی۔

جب میں یہاں باقاعدگی سے رہنے لگا تو پڑوسی بار بار ہمارے گھر آکر دیکھتے۔ کوئی کھڑکی سے جھانک لیتا تو کوئی سرسری گزر جاتا۔ کوئی رک کر پوچھ لیتا۔ کیا نئے کرایہ دار ہیں۔

ہاں ———— نئے لوگ ہیں۔

کوئی اندر آکر بے تکلفانہ انداز میں کہنے لگتا۔ یہاں آدم رہتا تھا۔ بڑا بہادر آدمی تھا۔ لیکن اب نہیں رہا۔ اس کا سب کچھ لٹ گیا، برباد ہوگیا۔ پولس نے اس بےگناہ کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ پہلے تو تلاشی کے نام پر اس کے فلیٹ کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا گیا۔ اور بعد میں اسے گولیوں سے بھون دیا۔ آدم کی مخبری بھی کسی مسلمان نے ہی کی تھی۔ وہ بےچارا تو صرف اتنا ہی کر رہا تھا کہ اس کالونی کے مکینوں کو فسادی جنونیوں سے بچا رہا تھا۔ وہ جب تک رہا۔ نورانی مسجد پر حملہ نہیں ہونے دیا۔ آدم کے قتل کے بعد دوبار مسجد پر حملہ ہوا۔ اور ایک دیوار بھی شہید ہوگئی۔

میں تو ''پرتکشانگر'' سے صرف اسی لیے یہاں منتقل ہوا تھا کہ کم از کم محفوظ رہوں گا۔

مگر یہاں بھی ویسے ہی حالات ہیں۔

وہی پولس،

وہی فسادی،

اور وہی تلاشی۔

کچھ بھی تو نہیں تبدیل ہوا تھا۔

اس درمیان مجھ سے ملنے کئی لوگ آئے۔ اور ہر شخص آدم کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات دے جاتا۔

کوئی تعریفوں کے پل باندھتا تو کوئی آدم کو ہیرو ثابت کرتا کوئی اس سے ہمدردی ظاہر کرتا تو کوئی اس کے لیے آنسو بہاتا۔ کوئی آدم کی تلوار کا قصہ لے بیٹھتا۔ آدم جس تلوار سے مقابلہ کرتا تھا وہ تلوار اب پولس کے قبضہ میں تھی۔

آدم کے واقعات اور بہادری کے قصے سن کر میں دھیرے دھیرے اس کے قریب پہنچ جاتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے آدم سے برسوں پرانی شناسائی ہو۔

ہمارے یہاں آدم جیسے بہادر ایک اور صرف ایک ہی کیوں ہوتے ہیں۔ آدم بھی تنہا تھا۔ بےچارہ شہید ہوگیا۔ اپنوں کے لیے اس نے جان دی یا اپنوں نے ہی اس کی جان لے لی۔ کسی مخبر ہم مذہب نے، سنا تو یہ بھی گیا کہ کوئی برقعہ پوش مرد، پولس کے ساتھ ہوتا تھا۔ دلیر، بہادر اور نڈر مسلم نوجوانوں کی نشاندہی کرتا تھا جو ترشول برداروں سے مقابلہ کرتے رہے تھے اور مسلم بستی پر ہر حملے کو ناکام بنارہے تھے۔

ان میں ایک چیالا آدم بھی تھا۔ جو مخبری کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ آدم کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ پولس اور ترشول برداروں سے وہ آنکھ مچولی کھیلتا رہا تھا۔ اس کا انجام یہی ہونا تھا یا تو اسے پولس ان کاؤنٹر میں مار دیتی یا پھر وہ ٹاڈا کا شکار ہو جاتا۔

بچاؤ کے سارے راستے بند کردیئے گئے تھے۔

صبح میں سکندر بھائی کے پاس چلا گیا۔

آدم کے فلیٹ میں رہنے کی وجہ سے وہ مجھے پسند کرنے لگے تھے۔ وہ پابندِ وضع اور نستعلیق آدمی تھے۔ ایک پُر وقار شخصیت کے مالک۔

میں اکثر ان کے گھر چلا جاتا اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرتا۔

ایک دن ان سے میں نے آدم کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کی۔ پڑوسیوں نے آدم کا نامکمل نقشہ دکھا کر میرے تجسس کو جگا دیا تھا۔ جب میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ آدم کے بارے میں کچھ بتائیں تو وہ سنجیدہ ہوگئے

اور انھوں نے غمگین لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

"آدم پر الزام تھا کہ وہ گول دیول پر حملہ کی غرض سے تلوار لیے گھوم رہا تھا۔ اس نے مدینہ بیکری سے پولس پر کراس فائرنگ کی اور نورانی مسجد پر حملہ کے دن ترشول برداروں پر بم پھینکا' اس بے چارے کا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہ تھا۔ ماں باپ تو بمبئی آتے ہوئے کسارا گھاٹ پر بس حادثہ کا شکار ہوگئے تھے۔ صرف ایک چھوٹا بھائی ہے جو اس سے کسی بات پر تکرار کرکے بھیونڈی جابسا تھا۔ وہاں پاور لوم کنٹراکٹ پر چلاتا تھا۔ اور ہر جمعہ چھٹی کے دن آدم کی خیریت جاننے کے لیے ضرور آتا تھا۔ اس لیے بھی کہ ان دنوں آدم کا سماجی معیار دن بدن گرتا جارہا تھا۔ وہ آدم کو بھیونڈی لے جانے کی جان توڑ کوشش کرتا رہا۔ مگر آدم یہاں سے جانے کو تیار نہ تھا۔ آدم کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ محض اس لیے کہ وہ اسے مرد کا سکھ نہیں دے سکا تھا۔ محلہ اور عمارت کے لوگ اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ سبھی اسے ''چوتی کم'' یا پھر آدم ''ماموں'' چڑاتے تھے۔

آدم بھنڈی بازار میں سیف الدین کیکا بھائی کی دوکان پر کام کرتا تھا۔ جہاں سے لوگ ہدیہ دے کر عربی قاعدے اور قرآن شریف لے جاتے تھے۔ آدم کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا گیا۔ مگر عید' بقرعید کی نمازوں کا وہ بڑا اہتمام کرتا تھا۔

اس کا کوئی شوق نہیں تھا۔ صرف آنکھوں میں سرمہ لگانا' بنارسی بھولا پان کھانا اور

موگرے کے گجرے خرید کر انھیں ہاتھ پر باندھ کر سونگھتے رہنا۔

یہ ساری باتیں سننے کے بعد مجھے آج پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ اپنوں کے درمیان جینے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ میں تو بچپن سے ان لوگوں کا پڑوسی تھا جو اب ترشول بردار بن گئے تھے۔ برسوں پہلے میرے آبا و اجداد اترپردیش سے تلاش معاش میں بمبئی آئے تھے اور یہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہ پرتکشیا نگر سے کہیں اور جا بسنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ہمارے چاچا عبدالمجید تو پاکستان چلے گئے مگر والد صاحب کہیں بھی نہیں گئے۔

نہ وطن اور نہ پاکستان!

بس تب سے وہ اس پرتکشانگر کو اپنا وطن سمجھنے لگے تھے۔ آخری ایام تک یہیں رہے۔ سمیع اللہ کمپاؤنڈ قبرستان میں میرے والد اور دوسرے رشتہ دار دفن ہیں۔ اور شبِ معراج، شبِ برات اور شبِ قدر پر فاتحہ کے لیے قبرستان ضرور جاتا ہوں۔

میں جس علاقے میں پھنس گیا تھا وہاں نہ تو کوئی اپنا تھا اور نہ کوئی رشتہ دار۔

بس سب کے سب ترشول بردار تھے۔ جو بات کم کرتے ترشول زیادہ چلاتے تلواریں دکھاتے، ڈراتے دھمکاتے، پاکستان چلے جاؤ کے نعرے لگاتے۔

برسوں سے جو ہمارے اچھے پڑوسی ہوا کرتے وہ ایک پل میں ہمارے دشمن ہوگئے تھے۔ تعصب کی لہر نے دوستی، رواداری، انسانیت، پیار، محبت، خلوص سب پر اپنا زعفرانی رنگ چڑھا دیا تھا۔ اسی لیے فضا بارودی ہوگئی تھی۔ صورت حال دھماکو، اور حالات غیر یقینی۔۔۔۔۔۔

جب میں یہ سب سوچتا ہوں تو میرے اندر کا میں خوف زدہ ہوجاتا ہے۔ اور ہانپنے لگتا ہے۔ پھر بھی مجھے یوں لگتا ہے کہ اپنوں کے درمیان رہ کر ہی میں اپنی حفاظت کرسکتا ہوں۔ اور رحمت نگر کالونی میں منتقل ہونے کا مطلب شاید یہی تھا۔ یہ علاقہ کثیر مسلم آبادی پر مشتمل تھا۔ ترشول برداروں نے کئی بار، اسکول، نورانی مسجد، مدینہ بیکری، مکہ ہوٹل پر حملے کیے مگر

کامیابی ان کے حصے میں نہیں آسکی۔ صرف ہائی وے پر غریب نواز پان شاپ ہی نذرآتش کرسکے۔ بوتل بازی، پتھراؤ، فائرنگ، اور کومبنگ آپریشن کے نام پر اندھا دھند تلاشی اور توڑ پھوڑ تو معمول بن چکا تھا۔ اس سب کے باوجود رحمت نگر کالونی کا علاقہ محفوظ ہی تھا۔

دوسرے دن صبح جب میں اردو اخبار پڑھنے کی غرض سے سکندر بھائی کے گھر گیا تو اخبار تیسرے منزلہ پر پروفیسر صاحب لے گئے تھے جو کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ سکندر بھائی مسکراتے ہوئے طنزاً کہنے لگے۔

''اخبار عمارت کے سبھی فلیٹوں کا سفر کرتا ہوا اگر اپنی اصلی حالت میں آجائے گا تو پڑھ لینا آؤ بیٹھو ——— جب تک تم یہ دوسرا اخبار دیکھو———''

میں نے کہا یہ تو میرے یہاں بھی آتا ہے میں دیکھ چکا ہوں۔ آؤ ہم گپ شپ کرتے ہیں۔ ایک ایک پیالی ہو جائے۔

میں وہیں بیٹھ گیا اور بات شروع کی۔ ۔ ۔ سکندر بھائی کیا سنجے دت بم دھماکہ مقدمہ سے بری ہوجائے گا۔ تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے کہنے لگے۔ آدم بھی نہیں بچ پایا تھا۔ پھر وہ آدم کی زندگی کے اندھیرے راستوں کی طرف چل پڑے اور بہت دور نکل گئے میں بھی آدم کی ٹریجڈی کے متعلق سوچنے لگا۔

سکندر بھائی نے بتایا کہ آدم کو پناہ دینے کے جرم میں انھیں بھی پولس کے ظلم کے چابک سہنے پڑے۔ آئے دن تلاشی کے نام پر ان کے فلیٹ کا نقشہ بگاڑ دیا جاتا۔ ٹاڈا کے ڈر سے خاموش رہنا پڑتا ہے۔ ایسا نہیں کہ آدم کے دشمن صرف پولس اور ترشول بردار ہی تھے بلکہ ایک دفعہ تو عمارت کے سبھی بچے، جوان، عورتیں اور بوڑھے بھی اس کے دشمن ہوگئے تھے۔

جانتے ہو کیوں؟ ——— سکندر بھائی نے کرسی قریب کھسکا کر سرگوشیانہ انداز میں کہا ——— پہلے تو آدم پر شک کیا گیا پھر اس پر کڑی نظر رکھی گئی۔ اور ایک دن آدم کو ایک لڑکے کے ساتھ رنگے ہاتھوں دھر لیا گیا۔

عمارت کے نوجوانوں نے اس کی پٹائی کی۔

اس کا منہ کالا کیا گیا۔ اور پھر اس سے نفرت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ محلہ کے کچھ نوجوان اسے دیکھ کر سیٹی بجاتے، فقرے کستے اور چھیڑ چھاڑ کرتے۔ ان دنوں صرف میں نے ہی آدم کو انسانی ہمدردی کی نظر سے دیکھا اور اس کا ساتھ دیا تو عمارت کے لوگوں نے میرے خلاف بھی ایک محاذ بنالیا۔ مجھ کو بھی ذلیل کیا گیا۔

سکندر بھائی اداس ہوگئے۔ وہ آدم کے بارے میں سوچے جارہے تھے۔ انسانی رشتے سے وہ آدم کے مددگار اور ہمدرد تھے۔

اداسی کے بادل چھٹ گئے تو وہ کہنے لگے اب ہمیں ترشول برداروں سے کہیں زیادہ خطرہ تو اپنے لوگوں سے ہے۔ ان مسلمانوں نے آدم کو پہچانا نہیں۔ اس کی قدر نہیں کی۔ اسے تو ''چونی کم'' ہی سمجھتے رہے وہ بڑا بہادر اور نڈر تھا۔ سیف الدین بھائی کے ساتھ رہ کر بھی وہ ڈرپوک نہیں بنا تھا۔ جہاں اس میں تھوڑی بہت برائیاں تھیں۔ وہیں وہ بہت سی خوبیوں کا مالک بھی تھا۔

میں نے آدم کے بارے میں اتنا کچھ جان لیا تھا کہ اب وہ مجھے ہر جگہ دکھائی دینے لگا۔
کبھی وہ میرے سامنے آجاتا مجھ سے باتیں کرنے لگتا۔
کبھی مسکراتا تو کبھی قہقہے لگاتا اور کبھی اداس ہوجاتا۔ سکندر بھائی کی طرح۔ کبھی ٹیرس پر ٹہلنے لگتا۔ کبھی میرے کمرے میں آجاتا۔ میری بچی نیلما کے ساتھ کھیلنے لگتا اسے گود میں اٹھاکر پیار کرتا۔ کبھی غریب نواز پان شاپ پر کھڑا پان چباتا اور کبھی موگرے کے گجرے سونگھتے ہوئے مسکراتا رہتا۔

میں ڈر گیا تھا۔

مجھے لگا آدم مجھے خوف زدہ کررہا ہو۔ میں نے تو اس کا گھر کرایہ پر لیا ہے اور ڈپازٹ بھی دیا ہے۔ کوئی ناجائز قبضہ تو نہیں کیا؟ بلکہ اسی بہانے اس گھر اور آدم کی حفاظت کررہا ہوں۔ عمارت کے لوگوں نے شاید آدم کو گمنامی کی اندھی قبر میں بہت گہرائی تک دفن کردیا

تھا۔ مجھے اب بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ فضا میں بربریت اور انتقام کی بارود بکھری ہوئی ہے۔ اور یہ عفریت میرے تعاقب میں ہے۔

ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ ابوبکر بھائی دوڑتے ہوئے آئے اور کہنے لگے۔

ہندماتا ٹاکیز کے سامنے ایک زبردست بم دھماکہ ہوا ہے۔ اور دادر ریلوے اسٹیشن پر دوسرا دھماکہ! شہر ایک بار پھر تناؤ کی لپیٹ میں آگیا۔ بھگدڑ، افراتفری مچ گئی اور خوف و ہراس نے شہر میں ڈیرہ ڈال دیا۔ شام ہوتے ہی خوفناک سناٹوں نے اپنے تیز ناخن شہر کی گردن میں پیوست کردیئے۔ عمارت کے سبھی لوگ اپنے بچاؤ کی تدبیریں کرنے لگے اور مورچے پر جم گئے۔

ٹیرس پر چہل پہل ہونے لگی۔

ہتھیار یہاں سے وہاں منتقل کیے جانے لگے۔ فوکس لائٹ لگادی گئی۔ سبز پٹیاں پیشانیوں پر چپک گئیں۔ تلواریں چمکنے لگیں۔ اور فضا نعروں سے گونجنے لگی۔

میں سیدھا سکندر بھائی کے گھر چلا گیا۔ مجھے خوب پتہ تھا کہ سکندر بھائی ہی عمارت کے لوگوں کی صحیح رہنمائی کریں گے۔ کیونکہ وہ ایک تجربہ کار شخص ہیں سکندر بھائی کا گھر مقفل پاکر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ پتہ چلا کہ وہ اپنی بیوی بچوں کو لے کر قریش نگر چلے گئے ہیں۔ یہ سن کر میرے اطمینان کے سورج کو بے چینی کا گرہن لگ گیا۔

میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے۔ ''پرتکشانگر'' سے تو ''جے شری رام'' کا نعرہ لگاکر بھاگ نکلا تھا۔ ترشول برداروں نے مجھے اسی شرط پر جیون دان دیا تھا۔ مگر یہاں پر کیا ہوگا؟ اور کیسے ہوگا؟ اگر حملہ ہوا تو اس کے بعد گرفتاریاں اور تلاشیاں۔

اس تصور ہی نے مجھے اندر سے لرزادیا۔

عمارت کے نوجوان ٹیرس پر بیٹھ کر گپ شپ کررہے تھے اور اپنے ہتھیاروں سے باخبر تھے۔ سامنے کے محلے کی جانب نظریں گاڑے حملے کے منتظر تھے۔

دوچار روز بڑے قیامت خیز ہوں گے۔ میں بار بار ٹیرس پر آتا ہوں مورچہ دیکھ کر مجھے اطمینان تو ہو جاتا ہے مگر شک کی دیمکیں مجھے کھوکھلا کیے جاتی ہیں کہ اگر حملہ ہوا تو کیا میں بچ پاؤں گا؟ اور کیا یہ نوجوان کامیاب ہو جائیں گے دفاع کرنے میں؟

نیند کا پرندہ آنکھوں کے گھونسلے سے اڑ چکا ہے اور رات کی شمع دھیرے دھیرے پگھل رہی ہے میں کسی پتنگے کی طرح بے چین یہاں سے وہاں جارہا ہوں کہر آلود رات کے سناٹے میں نعروں کی آوازیں سن رہا ہوں۔ بارود کی بو فضا میں رچی ہوئی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شخص میرے تعاقب میں ہے۔ میرے ساتھ ساتھ ہے آگے ہے پیچھے ہے۔ مگر کون۔ یہ میں جان نہیں پاتا ہوں ——————

اچانک دروازے پر دستک ہوتی ہے اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے؟ میں گھبرا جاتا ہوں۔ مگر پھر سوچنے لگتا ہوں شاید ٹیرس پر بیٹھے نوجوان پانی لینے آئے ہوں گے۔ یا پھر سکندر بھائی؟ نہیں ——— وہ تو قریش نگر گئے ہوئے ہیں۔ اسی کشمکش میں گھبراتے ہوئے دروازہ کھولتا ہوں تو حیرت و خوف سے میرے اندر سے ایک چیخ ابھرتی ہے۔ خون میں لت پت اجنبی شخص کو دیکھ کر میں حواس باختہ ہو جاتا ہوں اس کے ہاتھ میں ایک ننگی تلوار ہے جو اندھیرے میں چمک رہی ہے۔ میں اپنے حواس بحال کر کے اس اجنبی شخص سے دریافت کرتا ہوں۔

کون ہیں آپ؟ کس نے کی آپ کی یہ حالت؟ اور یہاں کیوں؟

میری زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔

وہ بہت زیادہ زخمی ہے اس کے جسم کے ہر حصے سے خون بہہ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن کی گلیوں میں خیالات کا مارچ ہونے لگتا ہے اس کے زخمی ہونٹ پھڑپھڑاتے ہیں۔

''یہ گھر میرا ہے۔ میں آدم ہوں۔ اور یہ میری تلوار ہے۔'' ''یہ لو سنبھالو اسے'' ——— کھڑاک - - - کھڑاک - - - کھڑاک - -

ذہن کی گلیوں میں مارچ تیز ہوگیا۔ خون میری رگوں میں تیز تیز دوڑنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا وہ مجھے تلوار تھماکر غائب ہوگیا۔ اور میں شش و پنج کے ہرقان میں مبتلا آدم کے بارے میں مسلسل تسوچ رہا ہوں کہ آخر یہ آدم اچانک کہاں سے آگیا۔

اب میرا یقین پختہ ہوگیا تھا کہ اس گھر میں آسیب ہے۔ آدم یہیں کہیں موجود ہے۔ اگر ہے تو کہاں۔ مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتا؟ اور اس تلوار کا میں کیا کروں؟--------

میں واقعی ڈر گیا تھا۔

رات مجھ پر بھاری تھی۔

ایک بہت بڑا بوجھ تھا۔ میرے ذہن پر، آدم کا تصور مجھے بے چین کیے ہوئے تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں نے رات کو دن کیا۔ اور صبح سویرے آدم کا یہ گھر چھوڑ کر بڑے بھائی کے پاس اسلام پورہ چلا گیا۔ جہاں سبھی مسلمان پوری طرح محفوظ تھے۔ یا وہ ایسا سمجھتے تھے کہ وہ وہاں محفوظ ہیں۔ کیونکہ اس علاقہ کو چھوٹا پاکستان کہا جاتا تھا۔ کیونکہ وہاں پر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ دھر پکڑ' نہ گرفتاریاں نہ تلاشیاں اور نہ کومبنگ آپریشن---- بیوی بچی اور خودکو محفوظ کرنے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا

راستے تو بند کردیئے گئے تھے۔

کئی دنوں بعد جب حالات امن کی سانس لینے لگے تو میں واپس آگیا۔ رحمت نگر کالونی میں خوش تھا کہ چلو خطرہ تو ٹل گیا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ عمارت کے لوگ مجھے حقارت اور نفرت سے دیکھ رہے تھے۔ گھور رہے تھے' کچھ منہ بنا رہے تھے۔ کسی نے کچھ کہا نہیں۔ میں نظریں جھکائے چپ چاپ گھر میں چلا گیا۔

شام کے اندھے سائے دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے اور مجھے ان اندھے سایوں سے خوف محسوس ہورہا تھا۔ تبھی چند نوجوان میرے گھر آئے اور کہنے لگے - -

ابھی تھوڑی دیر بعد ''امن کمیٹی'' کی میٹنگ ہے۔ آپ کی شرکت ضروری ہے۔ ان میں کچھ ہندو بھی دکھائی دیئے۔ میں نے حامی بھرلی۔ اور نیاز گنجو سے سرگوشی کی۔

آخر ہوا کیا؟۔ ۔ ۔ حملہ ہوا تھا؟۔ ۔ ۔ کیا ہم کامیاب ہوئے؟

طلبہ کے گانے کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ نیاز بھی گنگنانے لگا۔ ۔ ۔

''ہم ہوں گے کامیاب
ہم ہوں گے کامیاب ایک دن
من میں ہے وشواس'
پورا ہے وشواس'
ہم ہوں گے کامیاب ایک دن ۔ ۔ ۔ اوہو۔ ۔ ۔ اوہو۔ ۔ ۔ ''

نیاز گنجو نے سوچوں کے سلسلے کو توڑ دیا۔ اور بڑے تعجب سے کہا۔

''تم کو مالوم نئی کیا ——— ارے ساب کرسمہ ہوا ہے ——— کرسمہ ———

''مگر کیسے؟ ——— آخر ہوا کیا؟ ——— '' میرے تجسس کے پرندے پھڑپھڑانے لگے اب بتاؤ بھی ——— مجھے واقعی علم نہیں ———

''دراصل بات یوں ہے کہ اس عمارت کے پیچھو جو مسجد ہے نا؟ نورانی مسجد ———ہاں ——— اس مسجد پر ہندوؤں نے دو بار حملہ کیا۔

ایک رات وہ تلواریں 'کیروسین' اور پٹرول بم چھوڑ کر سٹک گئے تھے۔ اور بھگدڑ میں کتے تو گر پڑے اور اٹھ نہ سکے۔ کتے تو بیمار ہوگئے کتوں کو تو جلاب چالو ہوگیا۔''

''مگر ایسا کیا ہوا تھا کہ اچانک ——— بھگدڑ مچ گئی۔''

نیاز گنجو قریب آکر بڑی آہستگی سے کہنے لگا۔ ''نورانی مسجد کے گیٹ پر ان ترشول دھاریوں کو کوئی لمبا تڑنگا آدمی ننگی تلوار لیے دکھائی دیا جو سفید جبہ پہنے ہوئے تھا۔ اور جس کی سفید داڑھی سینے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک دم لمبا تڑنگا آدمی ——— وہ لوگ ایسا بیچ بولتے ———یئیچ واسطے تو وہ مانڈولی کرنے آئیلے ہیں ———!! ایک اور بات آج رات نو بجے سب کی مرضی سے اس کالونی کا نام بدل کر ''آدم کوپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی رکھا جارہا ہے۔ چلو ——— نیچو آؤ ——— ذرا دیکھو۔ انسپکٹر گائیکواڑ آئے ہوئے ہیں۔ وبیچ

ادھ گھاٹن کریں گے ——کالونی کے نئے بورڈ کا———!!"

میں دروازہ بند کرکے اندر چلا جاتا ہوں۔

رات کی شمع دھیرے دھیرے پگھل رہی ہے اور نیند کا پرندہ آنکھوں کے گھونسلے سے اڑ چکا ہے۔

بیوی حسرت بھری نگاہوں سے بار بار میری طرف دیکھے جا رہی ہے۔

گلاب بستر پر کانٹوں کی چبھن محسوس کر رہی ہے۔ اور کروٹیں بدل رہی ہیں۔

میں آہستہ آہستہ بیوی کی طرف بڑھتا ہوں اس کے بدن کی آنچ مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ میں اس کی طرف لپکتا ہوں۔ اور اپنے سخت کھردرے ہاتھ اس کی ننگی پیٹھ پر رکھ دیتا ہوں———

بس اسی وقت مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں بالکل سرد ہو گیا ہوں———

برف کے تودے میرے اندر کہیں پگھلنے لگتے ہیں اور میں بیوی کے قریب ہی ڈھیر ہو جاتا ہوں۔ - - - -

●●

تاثرات کے آئینے میں

● مجھے کہنے دیجئے کہ ان افسانوں میں مظہر سلیم نے خارجی زندگی کی نقش گری میں کردار کے نفسیاتی زاویوں کو خاص طور پر پیش نگاہ رکھا ہے۔ اس لئے جہاد کے افسانوں میں "تار دہر دو رنگ" کی کیفیت ہے۔ اس کیفیت کو افسانہ نگار کے اسلوب کی روش، زیادہ کی جمالیاتی تہیں، کہانی پن اور نئی جہاد اور بڑھا دیتی ہیں۔ مظہر سلیم اگرچہ نووارد ہے مگر اس کے افسانوں میں جو فنی پختگی ہے اس سے افسانہ نگار کے روشن حال اور روشن تر ماضی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے"

------ پروفیسر عنوان چشتی دہلی

● جہاد کے بیشتر افسانے مجھے اچھے لگے ہیں۔ بامعنی لگے ہیں اب میں آپ سے مانوس ہونے لگا ہوں اپنی اور کہانیاں مجھے پڑھوایئے اور خدارا ناقد کے بہکاوے میں نہ آیئے گا نہ تعریف میں نہ تنقیص میں۔ اس سے بہت محتاط رہیئے۔

------ قمر احسن دہلی

● اتنی خوبصورت کہانیاں لکھنے پر مبارک باد قبول کرو۔ "واگھ مارے نے خودکشی کی ہے" نے بے حد متاثر کیا۔ آج اسی قسم کی کہانیوں کی ضرورت ہے۔ وہ دن دور نہیں جب تم اپنی محنت اور لگن سے اپنا مقام بناؤ گے۔ گلاب کی خوشبو کی پہچان کے لئے اس کی مہک کافی ہے۔

------ قاضی مشتاق احمد پونے

● میں نے عزیز قیسی مرحوم کا ابتدائیہ "آپ کا" میرا اولی جہاد اور اس مجموعہ کا پہلا افسانہ "واگھ مارے نے خودکشی کی ہے" پڑھ لئے ہیں آپ کا افسانہ مجھے اچھا لگا اس لئے بقیہ افسانے بھی پڑھنا چاہوں گا میرا خیال ہے عزیز قیسی نے آپ کے Talent سے متاثر ہو کر آپ کے محاسبے میں ذرا سختی برتی ہے تاکہ اپنے آئندہ مجموعے میں آپ مزید نکھر آئیں۔

جوگندر پال

● آپ کے افسانوی مجموعے میں سب سے زیادہ دلچسپ افسانہ آپکا ادبی جہاد ہے جس میں آپ نے اتنی سچائی کا اظہار کیا ہے کہ سچائی تلخ بن کر سامنے آتی ہے اس طرح کی سچائی بیان کرنے کی ہمت عام طور پر افسانہ نگاروں میں نہیں پائی جاتی ہاں ساجد رشید کے یہاں یہ رنگ ہے کہ وہ بھی سچائی کے اظہار میں ذرا نہیں جھجکتے۔ یہ بھی ایک جہاد ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس آلودہ شہر میں چند نوجوان افسانہ نگار ہتھیلی پر سچائیوں کے چراغ جلا کر اندھیروں کو کاٹتے چھانٹتے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

------- ڈاکٹر سید محی رضا، ممبئی

● آپ نے کہانیوں کو کہانی کی طرح لکھا ہے۔ جبکہ ممبئی کے بیشتر احباب کہانی کو فارمولا سمجھتے ہیں آپ کا سیدھا سادہ انداز کم از کم مجھے تو بہت اچھا لگا جیسے میں بہت خوبصورت نظمیں پڑھ رہا ہوں۔

------- حفیظ آتش، امروہہ

● مظہر سلیم کے افسانوں کا مجموعہ جہاد حقیقتاً سماجی برائیوں کے خلاف موصوف کا قلمی جہاد ہے۔ اگرچہ افسانوں کی فضا پر ممبئی اور بھیونڈی کے سماجی ماحول کی چھاپ گہری ہے۔ اسکے باوجود وہ صداقتیں قاری کے ذہن کو جھنجھوڑتی ہیں جن کا تعلق کسی خاص مقام سے نہیں بلکہ ہم پورے ملک میں ان کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

------- غلام نبی مومن، پونے

● نویں دہائی میں اردو افسانے کا ایک اہم نام مظہر سلیم کا ہے۔ انہوں نے اپنے تخلیقی سفر میں عہد بہ عہد ترقی کی ہے اور کہانی میں بیانیہ اور کہانی کی بازیافت کو اولیت دی ہے۔ موصوف کا تخلیقی سفر ایک دہے پر محیط ہے۔ ان دس برسوں میں انہوں نے اپنے آس پاس سے اور آج کے انسانی ذہن کی فکر سے بہت کچھ حاصل کیا ہے اسی لئے انکے افسانوں میں عصری حسیت کے ساتھ ساتھ تلخی کا بھی احساس ہوتا ہے اور یہ تلخی ایک فن کار کے خلوص کی غماز ہے"۔

------- اصغر حسین قریشی (مدیر تکمیل بھیونڈی)

● آپ کی کہانیوں میں مہاراشٹر (خصوصاً ممبئی) کی روح موجود ہے ایک مخصوص معاشرے کو ایک تمام تر یادو

ندیدگی کے ساتھ اجاگر کرنے میں آپ کامیاب ہیں۔ آپ کی کہانیاں Culture based ہیں۔ آپ اپنے تجربات و مشاہدات کے اظہار کا فن کارانہ استعمال جانتے ہیں اور ایک بڑی خوبی آپ کی کہانیوں میں یہ نظر آئی کہ قاری کو Involve کرنے اور دیرپا تاثر قائم کرنے کی زبردست خوبی ان کہانیوں میں ہے۔ اس سلسلے میں ایک بہت پرانی بیتی کا ذکر خاص طور کرنا چاہئے۔

------رفیع حیدر انجم (ارریا، بہار)

● آپ کی کہانیوں میں ایک تازگی ہے اور روشن و تابناک مستقبل کی پیش گوئی بھی، میری دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

------رئیس الدین رئیس، علی گڑھ

● جہاد میں عصری حسیت جھلکتی ہے اور اس عہد کی آپ کی طرف نگاہ اٹھتی نظر آتی ہے۔ اس کتاب کا نام سائبان بھی ہو سکتا تھا۔

------احمد وصی، ممبئی

● مظہر سلیم کا نام اردو افسانے کی دنیا میں نیا نہیں مگر ان کے افسانوں کے مجموعہ جہاد کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد ہم کو ایک ایسی پختگی کا احساس ہوتا ہے جو برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مظہر سلیم نے فیشن کے طور پر اس رویہ کو نہیں اپنایا۔ انکے بعض افسانوں میں انسان کی نفسیات کا بھی مطالعہ کیا گیا ہے بالخصوص افسانہ سائبان میں۔

------ابراہیم یوسف، بھوپال

● آپ کا افسانہ ''باوجی'' بہت اچھا افسانہ ہے۔ ایک فرد کے حوالے سے ایک پورے معاشرے کا تعارف اور پھر ہر نئی نسل کے بلند آہنگ ارادوں کے باوجود انسانی مقدر کا تسلسل بڑے اثر انگیز انداز میں آپ نے نمایاں کیا ہے۔

------مخمور سعیدی، دہلی

● مظہر سلیم نے جہاد کو ادب نہ تو دھماکہ کہا ہے نہ ہی کوئی بڑا ادبی کارنامہ، یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مظہر سلیم اپنے تعلق سے کسی قسم کی خوش فہمی کا شکار نہیں ہیں بلکہ وہ حقیقت پسندانہ فکر کے حامل ایک

ایسے حساس نوجوان میں جو اپنے ماحول کی سماجی آلودگی، استحصال، عدم مساوات، ظلم و استبداد، بے چینی، اضطراب اور عدم محفوظیت کے احساس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور جہاں مظہر سلیم کی ایک ایسی ہی صدائے احتجاج ہے۔

------ جاوید ندیم (یوتھ مہاراشٹر)

• مظہر سلیم کی کہانی کھوں ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جو اپنی تمام بے چارگیوں اور محرومیوں کے باوجود زندگی سے پیار کرتا ہے۔ کھوں کا مرکزی کردار جہانگیر ایک ایسے شخص کی علامت بن گیا ہے جو انتہائی درجہ کا Ambitions بھی ہے اور اپنے خوابوں کی تشکیل میں مصروف جہد و عمل بھی۔ اپنے ٹریٹ مینٹ کے اعتبار سے مظہر سلیم کی یہ کہانی قابل ذکر ہے۔ مظہر سلیم کے یہاں اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، اور تہذیبی شعور و آگہی سے روشنی کشید کرنے کا عمل شدید ہے۔

------ سلیم انصاری، جبل پور

○ابراہیم اشک ——————— ممبرا تھانے

مظہر سلیم کے افسانے زندہ کرداروں کی معنویت کا اصل منظر نامہ ہے۔ جن میں بیان کی چمک، موضوعات کی دھنک اور شعور کی جھلک دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ممبئی کے جدید اور ہم عصر افسانہ نگاروں سے قطعی مختلف ہیں۔ ان کی شناخت بن چکی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ اردو افسانے کی دنیا میں ضرور کوئی نیا گل کھلائیں گے۔

○ایم مبین ——————— بھیونڈی

مظہر سلیم کا منفرد انداز تحریر افسانوں میں نہ صرف دلچسپی پیدا کرتا ہے بلکہ اپنی گرفت قارئین پر آخری سطر تک قائم رکھتا ہے اور قارئین کے ذہن میں تجسس جگا کر اسے افسانے کی آخری سطر تک پوری یکسوئی سے پڑھنے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مظہر سلیم کے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر لکھے افسانے بھی قارئین کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے ہیں۔

○ مہانگر کے نوجوان افسانہ نگاروں میں مظہر سلیم کا نام اہم ہے۔ مظہر سلیم مدیر بھی ہیں پبلشر بھی اور افسانہ نگار بھی۔ ایک طرف وہ بد عنوانیوں کے اس دور میں طلبہ کو اخلاقیات کا درس دے رہے ہیں تو دوسری طرف اردو ادب کے لیے قارئین پیدا کرنے کی ذمہ داری لیے ہوئے ہیں۔ مظہر سلیم کے عنوان ہی قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ "اندر کا آدمی"، "نیا منظر نامہ"، "تعاقب"، "وامن راؤ کی واپسی"، "اپنے حصے کی دھوپ" اور "دیمک" وغیرہ۔ اپنے حصے کی دھوپ اتنا خوبصورت ٹائٹل ہے کہ یہ تو کسی شعری مجموعہ کا عنوان ہونا چاہیے تھا۔

مظہر سلیم کا افسانہ اپنی بیتی ہوئی زندگی کی کہانی ہے۔ یہ شخص برسوں سے اس مہانگر کی زندگی بھوگ رہا ہے۔ شہری زندگی کے تجربات، حادثات، کرب اور اذیتوں کو مظہر سلیم نے ایک ادیب کی عینک سے دیکھا ہے۔ افسانوں کا روپ دیا ہے۔ عام طور پر کوئی بھی ادیب اپنے معاصرین سے متاثر اور مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے موضوع، زبان، لب و لہجہ اور اسلوب مستعار لینا ہی ہے۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کرلا میں رہتے ہوئے بھی مظہر سلیم کا افسانہ سلام بن رزاق اور مشتاق مومن جیسے افسانہ نگاروں سے متاثر اور مرعوب نظر نہیں آتا۔ مظہر سلیم کا افسانہ بیانیہ ہے۔ پھر وہ "آدم ہاؤسنگ سوسائٹی" ہو یا "وامن راؤ کی واپسی"۔ یہ سبھی افسانے کھولی، بیئر بار، الاؤ اور بوڑھا شخص اور "اپنے حصے کی دھوپ" مہانگری جیون کا دکھ درد سمیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شہری زندگی کے چھوٹے موٹے حادثات سے دوچار کرنے والی یہ کہانیاں بنیادی طور پر اپنے Treatment اور اپنی صنف سے دیانت دار ہیں۔ اور ان کہانیوں کا یہ بڑا وصف ہے۔ ان دنوں ٹی وی سیریلوں نے کہانی کو زبردست نقصان پہنچایا ہے اسی لیے کہانی بستر مرگ پر سسک رہی ہے۔ ایسے میں مظہر سلیم اس ڈوبتی نبض کو تھامنے، اسے بچانے کی کوشش کر رہا ہے تو یقیناً افسانے کی تاریخ میں یہ واقعہ رقم ہونا چاہیے اور ہمیں مظہر سلیم کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ ○○

ڈاکٹر رام پنڈت

ممبئی
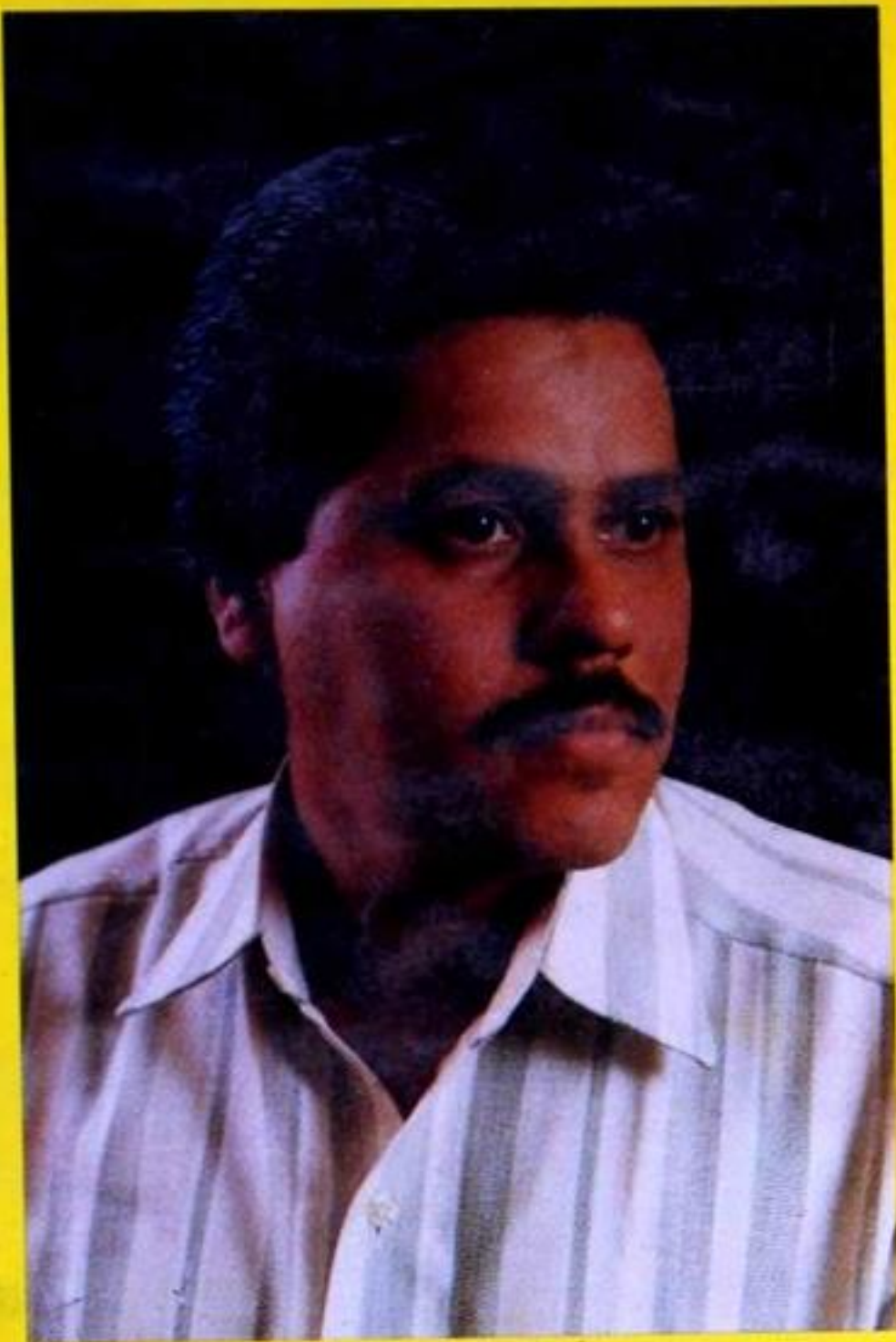
☆ مظہر سلیم کے افسانے یقین و گمان کی کشمکش کے افسانے ہیں۔ ہمارا عہد عقائد کی شکست اور اوہام کی فتح کا عہد ہے۔ تمام تر سائنسی ترقیوں کے باوجود عقلیت پسندی شرمسار اور تہذیب و شرافت ذلت سے ہم کنار ہے۔ ایسے میں فن کار کی امید پرستی ہی فن کے لیے کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔ اور مظہر سلیم نے اسی امید پرستی سے اپنی افسانوی محفل کے چراغ جلائے ہیں۔ اگرچہ "جہاد" سے "اپنے حصے کی دھوپ" تک مظہر سلیم کا سفر یقین سے بے یقینی اور ایمان سے انکار کا سفر ہے مگر ان کی زیرِ نظر کتاب کو میں ان کے ادبی قطع منازل کا ایک عارضی پڑاؤ سمجھتا ہوں۔ اُنھیں اس کے بعد خورشید کا سامانِ سفر تازہ کرنا ہے۔ اور اپنی ذات اور اپنے اطراف کے حصار سے نکل کر کارِگہِ آفاق کی سیر کرنی ہے جہاں انسانی سروں سے گزرتی ہوئی قیامت ان کے استقبال کے لیے سانس روکے کھڑی ہے اور دبی زبان سے کہہ رہی ہے۔۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

(ڈاکٹر) یونس اگاسکر

صدر شعبہ اردو
ممبئی یونیورسٹی